شعلۂ آواز

ہر ایک لفظ ہے دراصل زندگی کا ساز
ہر ایک لفظ سراسر ہے شعلۂ آواز

جوالا پرشاد شاہی

(جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں)

تزئین : جسونت سنگھ

خوش نویس : سید رشید حسین ۲۰۵- گڑھیا جامع مسجد دہلی۔

اشاعتِ اوّل : ایک ہزار

قیمت : پندرہ روپیے

پبلشر : جوالا پرشاد شاہی

سی 66- سیکٹر 14- چنڈی گڑھ۔

مطبوعہ :- جمال پرنٹنگ پریس دہلی

ملنے کا پتہ

۱- جوالا پرشاد شاہی- سی 66- سیکٹر 14/ چنڈی گڑھ

۲- لائل بک ڈپو، پنجاب یونیورسٹی، سیکٹر 14 چنڈی گڑھ



جوالاپرشاد شاہی

اِنتساب

میں اپنے اس حقیر سے مجموعۂ کلام کو مخزنِ علم و فضل، مربّی اور محبّی لالہ بال کرشن صاحب ایم۔ اے سیکریٹری، پنجاب یونیورسٹی پبلیکیشن بیوریو کے نامِ نامی سے معنون کرتا ہوں، جو نفیس اِنسانی اخلاق کا ایک مُرقّع ہیں اور بلند مقام عالمِ باعمل ہیں۔

جوالا پرشاد شاہی

رُباعی

ہو امن کہ پیکار، ترے بس میں نہیں
قُدرت ہے عجب کار، ترے بس میں نہیں
تُو چاند پہ جا سکتا ہے مانا؛ لیکن
سیّاروں کی رفتار ترے بس میں نہیں

شاہی

قطعہ

سُرمئی شام کی بہاروں میں
آرزوؤں کے پُھول کِھلتے ہیں
تیرے جلوے سمیٹتی ہے نظر
جِس گھڑی دونوں وقت مِلتے ہیں

شاہی

فہرست

۱	تعارف	صفحہ
	از جناب پنڈت گنگا دھر صاحب تسنیم	۷
۲	رائے	
	ابوالفصاحت جناب لبھو رام جوش ملسیانی	۲۰
	جناب ساگر نکودری	۲۱
	جناب رام کرشن صاحب مضطر ایم۔ اے	۲۲
۳	غزلیات	۲۹
۴	قطعات	۱۰۳
۵	نظمیں	
	وحدتِ انسانیت	۱۲۱
	مرے دیش کا شیر بانکا سپاہی	۱۲۳
	مادرِ ہندوستاں	۱۲۴
	میں بھول جاؤں تمہیں میرے بس کی بات نہیں	۱۲۵

صفحہ نمبر

سلام	۱۲۵
حمد	۱۲۶
پنڈت جواہر لعل نہرو کے جنم دن کی خوشی میں	۱۲۶
ہندوستاں ہمارا	۱۲۷
دیارِ ہند میں وہ بھی زمانے آئے تھے۔	۱۲۸
بھارت ماتا۔	۱۲۹
انقلابِ تازہ۔	۱۳۰
تاج محل۔	۱۳۱
میرے پیارے وطن	۱۳۲
فصلِ بہار	۱۳۳
شیرِ پنجاب لالہ لاجپت رائے	۱۳۳
لفظوں کی قیمت	۱۳۴
ـــــــ کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت	۱۳۴
اے وطن میرے وطن۔	۱۳۵
تم ہو بھارت کی جاگتی تقدیر	۱۳۷
نغمۂ آزادی	۱۳۸
امیرِ کارواں نہرو	۱۳۹
پیغامِ سفر	۱۳۹
بانسری والے آجا	۱۴۰
٦۔ رباعیات	۱۴۲

تعارف

شاعر باکمال ناثر بے مثال عالیجناب پنڈت گنگا دھر صاحب تسنیم سابق لیکچرار اردو پنجاب یونیورسٹی ایوننگ کالج چنڈی گڑھ، کے فصاحت ریز قلم سے!

پنڈت جوالا پرشاد شاہی کے ساتھ بہت سالوں سے میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس لئے انھیں جاننے کی طرح جانتا ہوں۔ مخلص اور وفادار دوست ہیں۔ اپنے متعلقین کے لئے حسب مراتب اپنے فرائض کو نہایت احتیاط اور شعور کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں۔ ان کے کردار میں سب سے بڑی بات جو قابل تعریف ہے وہ ہے اپنے پیشے کے ساتھ خلوص، فرض شناسی۔ غریب پروری اور محتاج نوازی۔ پنجاب یونیورسٹی کے ہیلتھ سنٹر کے فارمیسٹ کے طور پر ان کا تعلق یونی ورسٹی کے ہر درجے کے شخص سے پڑتا ہے۔ ان کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ سب لوگ ان سے محبت کرتے ہیں اور قابل عزت

تصور کرتے ہیں۔ اس کا سبب سیدھا سا ہے۔

بقول امیر مینائی ؎

خنجر چلے کسی پہ، تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مریض کو دیکھ کر ان کی چتون کا رنگ قابلِ دید ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سارے درد کو اس کے جسم سے چوس کر شیو بھگوان کے زہر کی طرح خود ہضم کر لینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شفا دست ہیں۔

یونیورسٹی کے صاحب اقتدار و اختیار لوگ اُنکی ادبی تحریکوں اور تقریبوں میں دل و جان سے اِنکی مدد کرتے ہیں۔ یہ ہر سال چار پانچ مشاعرے اور ادبی اجتماعوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ جن میں ہندوستان کے اکابر شعراء مدعو ہوتے ہیں۔ اُنکی دوستانہ خاطر تواضع سے شاہی صاحب کو دلی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کئی بار ایسے موقعوں پر مصارف، فراہم شدہ رقم سے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ بخوشی اسے اپنی جیب سے اس طرح پورا کرتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے۔

شاہی کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ مرنجاں مرنج ہونے کے باوجود اس درجہ خود دار اور غیور ہیں کہ وقت کے ساتھ رنگ بدلنے والے خود کام تنگ نظر اور مغرور انسان اِنھیں ایک نظر نہیں بھاتے اور اُن سے

ملنا اور بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن پھر بھی کسی کو اپنے طرزِ سلوک سے ناراض یا آزردہ ہونے کا بہت ناہی کم موقع دیتے ہیں۔

سیّد القلم پنڈت یوگی راج نظرؔ سوہانوی (مرحوم) جو قریب کے رشتے سے اِن کے چچا ہوتے ہیں، کے کلام سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ سچ پوچھیئے تو اُنکی ترغیب اور تحریک اُنکے شعر و سخن کی بنیاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں خلوص ہے، آہنگ ہے، تاثر ہے اور افادیت ہے۔ ان کے کلام کا نمایاں پہلو اسکی افادی قدر و قیمت ہے۔ اس لئے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے فن کی بیشتر بنیاد انسانی زندگی کے محسوسات اور موضوعات پر ہے۔ آج فضا نہ شعر انگیز ہے نہ ادب نواز۔ دراصل مطلب پرست اور زر پرست ماحول نے اور سیاسی مصلحتوں نے سماج میں کم ذوقی کو ہی ارزاں نہیں کر دیا بلکہ زبانوں اور ادب کو بھی سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے ذوقِ صحیح اور قیودِ فن کی پیروی کا فقدان ہو گیا۔ اُدھر کسبِ زر کی ہوس کی تسکین کے لئے سائنس اور ٹیکنیکل تعلیم کی ہمہ گیری نے زبانوں کی دلکشی اور اہمیت کو بہت حد تک تلف کر دیا۔ علم و ادب اور شعر و سخن کے لئے انہماک کے ساتھ شب و روز محو اور مصروف رہنے والے لوگوں کا زمانہ نکل گیا۔ اب فن میں جو تھوڑی بہت گیرائی رہ گئی ہے وہ ان چند اہلِ فکر و نظر کی دین ہے جو ہنگامی مقاصد کو ہیچ و حقیر سمجھ کر پر درش [illegible]

قلم کر رہے ہیں۔

ادب کی پست معیاری اور غریب مذاقی کا ایک سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ تقسیمِ وطن سے اب تک ہمارا گرد و پیش ہمارا سماج لمحہ بہ لمحہ تغیّر پذیر ہے۔ سماج کا کوئی متعیّن نصب العین نہیں۔ فنکار کا کردار اور اُس کی تخلیق اپنے ماحول کی ترجمان ہوتی ہے۔ وہ اپنے لئے آج ایک مرکزِ خیال مقرر کرتا ہے۔ اور کل اسے تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اس زمانے میں کسی بڑے فنکار کا پیدا ہونا دشوار ترین امر ہے۔ انسانی زندگی کی مثبت اقدار کی جگہ تیزی کے ساتھ منفی اقدار لے رہی ہیں۔ مادّی آلام و راحت اور عیش و عشرت کے سامان کی فراہمی کے باہمی مقابلے میں کچھ اہلِ اقتدار اور صاحبِ دولت لوگ اس قدر دیوانے ہو رہے ہیں کہ وہ انسان کی اجتماعی زندگی کے تصوّر سے بیگانہ محض ہو چکے ہیں۔ انسانوں کی بیشتر تعداد محتاج، مجبور اور بیقرار نظر آ رہی ہے۔ زندگی کے کسی شعبے کی منزل کا اب تک تعیّن نہیں ہو سکا۔ ان حالات میں کسی گراں بہا سرمایۂ ادب کی تخلیق ایک خواب ہے۔ جسکی تعبیر کہیں نظر نہیں آتی تاہم شاؔھی کے کلام کا مجموعہ اس گئے گزرے وقت میں غنیمت ہے۔ ؎

اے شاد آج ہر کس و ناکس ہے اہلِ فن
کرتے تھے ورنہ ہم بھی کبھی اہلِ فن کی بات

پنڈت جوالا پرشاد شاہیؔ کے کلام میں جہاں ایک طرف روایتی رنگ ہے وہاں غزل کا جمالیاتی ذوق حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں اور قوم و وطن کے اہم واردات کا مطالعہ بھی جا بہ جا نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں اِسم در روایت کا صحیح استفادہ ہے۔ اگر سب کی سب پرانی روایتیں قابلِ گردزدنی اور سوختنی ہوتیں تو ہر پشت کو نئے ماحول اور نئی زبان کی تشکیل و ترتیب کرنی پڑتی۔ میرؔ۔ نظیرؔ۔ غالبؔ اور اقبال نہ ہوتے تو جگرؔ۔ جوشؔ۔ فیضؔ اور فراقؔ کہاں ہوتے۔

۱۹۴۷ء میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے زور پکڑا۔ سخت گیری کے ساتھ گروہ بندی ہوئی۔ ایک مُصنّف اور شاعر کے لئے ایک نپا تُلا مخصوص لائحہ عمل تیار ہوا۔ کیا لکھا جائے۔ کس طرح اور کن درجوں میں اسے لکھا جائے پرانی روایتوں۔ مصنّفوں اور شاعروں کے ترکِ نام کا فرمان صادر ہوا۔ یار لوگوں نے متقدمین کو کوسنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ غالبؔ۔ اقبالؔ جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ کی شخصیت اور شاعری کا بھی خوب مضحکہ اڑایا گیا۔ لیکن چار پانچ سال کے بعد ان فرمانبردار اور فرمان بردار دانشوروں میں سے چند کو ہوش آیا تو انہوں نے پہلے فرمان میں ترمیم و تنسیخ کو مناسب خیال کرتے ہوئے تازہ حکم دیا کہ پرانی روایات سب کی سب بُری نہیں۔ ان میں سے بیمار اور صحت ور روایات کو الگ الگ دو قطاروں میں کھڑا کیا جائے۔ نتیجہ

یہ ہوا کہ اپنے گناہ کے کفارے کے لئے ان لوگوں نے کالی داس۔ تُلسی داس سور داس اور غالب کی یاد میں تقاریب منانا شروع کر دیں۔ لیکن اس تحریک میں اس قدر بڑی تعداد میں قابل اور ہونہار نوجوانوں کی ذہنی آزادی ذبح ہو کر رہ گئی جس قدر کہ ہمارے لکیر کے فقیر استادوں کے روائتی لبستوں میں گم نہیں ہوئی تھی۔ صد شکر کہ شاہی اس طوفانی اور بحرانی دور کا شکار نہیں ہوئے۔ انہوں نے قیودِ فن کی تعظیم کی ہے۔ فکر و خیال کے بیان کے لئے ہیئتِ ظاہری سے ترکِ تعلق نہیں کیا کیونکہ انہیں زبان آتی ہے۔ احساس اور مطالعہ کی گہرائی ان کے ہاں موجود ہے۔ اس لئے انھیں زبان و بیان کے لئے اور مواد کے لئے تخیل، دور افتادہ مبہم کنایوں اور استعاروں کی تلاش اور کسی سیاسی نظریئے کے اظہار کے لئے نئے تجربوں کا شوق نہیں ہوا۔

شاہی صاحب کے زیرِ نظر مجموعۂ کلام میں غزل کا حصہ قطعات اور نظموں کی نسبت وافر ہے جو انکے جمالیاتی ذوق اور حسنِ نظر کی غمازی کرتا ہے۔ اس کے باوجود انکے مطالعے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ان کے ذہن میں وطن کی محبت، تعمیر و ترقی، دفاع و رفاہ کے جذبات ٹھاٹیں مارتے ہیں۔ اشعار محولہ ذیل میں محاورے اور روزمرہ کی بے ساختہ اور برمحل اسناد (امثال) نمایاں ہیں۔

"میرے دلیش کا شیر جوان کا سپاہی" کا یہ بند:-

وہ میداں میں بھگدڑ مچا دینے والا
وہ دشمن کے چھکّے چھڑا دینے والا
وہ سپین کے پُرزے اُڑا دینے والا

چلا جا رہا ہے بڑھا جا رہا ہے مرے دیش کا شیر بانکا سپاہی

"مادرِ ہندوستاں" میں سے ایک بند :-

کس قدر شاداب ہیں تیری امیدوں کے چمن
تیرے دامن میں ہیں رقصاں ستلج و گنگ و جمن
اوجِ گردوں پر نمایاں تیری عظمت کے نشاں
مادرِ ہندوستاں اے مادرِ ہندوستاں

"بھارت ماتا" سے ایک بند :-

دیوتاؤں کو دیتے مار نہ دیں   تو نے اِن سب کی جاں بچائی ہے
ہاں اُٹھائے رکھو اپنا بایاں ہاتھ   آج دُرگا ہے تو بھوانی ہے

"انقلابِ تازہ" کا ایک بند :-

محروم ہیں جو دولتِ صبر و قرار سے   گھبرائیں اب نہ گردشِ لیل و نہار سے
ملنے کو ہے نجات غمِ روزگار سے   اِک انقلابِ تازہ کے آثار ہیں عیاں

"سلام"، "میرے پیارے وطن"، "لالہ لاجپت رائے"، "اے وطن میرے وطن"
بھی ان کی حُبّ الوطنی کے جذبات سے مملو نظمیں ہیں۔ ان کے یاں تہذیبِ احساس

حسنِ تخیّل سیدھی سادی اور میٹھی پیاری زبان اور خیالات کا ولولہ انگیز اظہار۔ واقعیت اور خلوص اظہار پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ ان کے اخلاق کی پاکیزگی کو ان کی غزلوں کے اشعار کی پاکیزگی میں دیکھئے۔ ان کا رنگِ تغزل اس غزل سے بہ کمال ظاہر ہوتا ہے۔

رنگین بہاروں کا ہے جلوہ کوئی دن کا — بہ رنگِ چمن زار ہے گویا کوئی دن کا
پل بھر میں بکھر جائیگا شیرازۂ ہستی — ہے روح کا اس جسم سے رشتہ کوئی دن کا
اے وادیٔ پُر کیف کے بھٹکے ہوئے راہی — گھبرا نہ کہ منزل کا ہے رستہ کوئی دن کا
مانا کہ ہر اک سمت ہیں پُر کیف نظارے — لیکن ہے نظاروں کا زمانہ کوئی دن کا
آجاؤ کہ اب جینے کی اُمید نہیں ہے — مہمان ہے بیمار تمہارا کوئی دن کا

غزلوں کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

میرے ہی آشیاں نے جلنا تھا؟ — اس میں سازش ضرور تھی سب کی

•

محبّت نے نیرنگ کیا کیا دکھائے — کبھی رو دیئے ہم کبھی مُسکرائے

•

دیکھ کر پیار کی نگاہوں سے — ہر گلہ دُور کر دیا تو نے

•

نظرِ دوست جب سے بدلی ہے — اپنی نظروں سے گرتا جاتا ہوں

دوستی کا بُرا ہو اے شاہی — دشمنوں کے بھی ناز اٹھاتا ہوں

•

وہ جنکو موجِ تلاطم بھی غرق کر نہ سکی — ڈبو دیا انھیں ساحل پہ ناخداؤں نے

•

اپنے دل و نظر سے نہ ہمکو گرائیے — ہم میں ہزار عیب سہی بے وفا نہیں

•

ہم نے یہ کب کہا کہ بڑے بے وفا ہو تم — دنیا یہ کہہ رہی ہے کہ تم با وفا نہیں

•

پھولوں کو عرفان ہوا ہے — کانٹوں کی آغوش میں پل کے

•

شاہی کے قطعات میں کئی مقامات پر طنز و تنبیہ کی تندی و تیزی ہے۔ جو کہیں کہیں جھلاہٹ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ شاعر کے عین خلوص اظہار کی دلیل ہے۔ ان کے محسوسات کی شدت ان کے الفاظ میں جھلکتی ہے اور سننے والے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ ان کی رباعیات اور قطعات پیش ہیں۔ پہلے اس رباعی میں دیکھئے انسان کی آسمان گیری اور ستاروں کی انسان پر فرماں روائی کا مضمون کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ انسان کی جد و جہد اور سعی و عمل تو ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور جاری رہے گی۔ لیکن نتائج کے لئے انسان کی مجبوری سے انکار

نہیں کیا جا سکتا

ہو امن کہ پیکار ترے بس میں نہیں
قدرت ہے عجب کار ترے بس میں نہیں
تو چاند پہ جا سکتا ہے مانا، لیکن
سیاروں کی رفتار ترے بس میں نہیں

•

ویرانے کو گلزار بنانا سیکھو
ماحول کو ہموار بنانا سیکھو
مجبور کے حالات پہ رونے والو
مجبور کو مختار بنانا سیکھو

•

ہم ہیں رشیوں کی پاکباز اولاد
ہم ہیں بھارت کے بازوئے فولاد
ظالمو! کان کھول کر سن لو
ہمیں ڈھائیں گے ظلم کی بنیاد

•

زندگی پُروقار ہو نہ اگر
ایسے جینے سے موت ہے بہتر
اپنی غیرت اگر ہو خطرے میں
جنگ ہوتی ہے فرض انساں پر

•

جس کو قانون آپ کہتے ہیں
وہ تو مکڑی کا ایک جالا ہے
جو تھا کمزور پھنس گیا اس میں
زور آور نے توڑ ڈالا ہے

•

لفظ حاضر ہیں اور معنی گم
بجھ گیا شعلہ دود باقی ہے
روحِ انسانیت ہوئی غائب
صرف خاکی وجود باقی ہے

یُوں تو دَر اَور بھی ہیں دنیا میں　　تیرے دَر کا مگر جواب نہیں
مری جھولی ہی تنگ ہے ورنہ　　تیری بخشش کا کچھ حساب نہیں

●

بدلے ہوئے حالات نے دِل توڑ دیا　　اس دَور کی ہر بات نے دِل توڑ دیا
غیروں کے مظالم کا تو کیا ذِکر اے دوست　　اپنوں کی عنایات نے دِل توڑ دیا

●

شاہیؔ کے ہاں دنیا کی مشکلات اور مصائب کا علاج انسان کا باہمی خلوص۔ محبت وفا اور ہمدردی ہے۔ چنانچہ اشعارِ ذیل میں اُن کے ذہن کا یہ نازک گوشہ ملاحظہ ہو۔

وَفا کے نُور سے رَوشن ہے کُل جہاں شاہیؔ
وَفا چراغ ہے اِس تیرہ خاکداں کے لئے

●

خُلوص و مہر و محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں　　بشر کے پاس یہ دَولت نہیں تو کچھ بھی نہیں

●

مہر و وفا کی بات کوئی دِل لگی نہیں　　لگتی ہے جی کی جان کی بازی نباہ میں

●

جس نے اِک بار محبت کی نظر سے دیکھا　　اُس پہ قُربان دلِ زار کیا ہے ہم نے

محبت حاصلِ کون و مکاں ہے — محبت آدمیت کا نشاں ہے
محبت کے محیطِ بے کراں میں — ہماری زیست کی کشتی رواں ہے

•

قصرِ امید کی شمعوں کو فروزاں کر دے — جادۂ شوق کے ہر ذرے کو تاباں کر دے
ہاتھ میں مشعلِ اخلاص و محبت لیکر — ظلمتِ دہر میں ہر سمت چراغاں کر دے

•

اسی موضوع پر ایک پاکیزہ نظم "وحدتِ انسانیت" کے یہ شعر لافانی ہیں:-

اصلِ آدم ایک ہے اور نسلِ آدم ایک ہے
سارا عالم ایک ہے یہ سارا عالم ایک ہے

•

ہو گئے عنصر بہم سب چھوڑ کر اضداد کو — بخش دی کتنی حسیں پوشاک آدم زاد کو

•

اشرف المخلوق ہے تو پیدا کر کوئی کمال — سچا بیٹا بن کے فطرت کی وراثت کو سنبھال

•

کہیئے انساں اُس کو ہے انسانیت جس کو عزیز
دُور کر دے لال پیلے گورے کالے کی تمیز

•

"سپنوں کی قیمت"۔ "میں تجھے بھول جاؤں"، "بانسری والے آجا"، "عورت"، "تاج محل" شاہی کی خوبصورت نظمیں ہیں۔

"شعلۂ آواز" موجودہ اردو ادب کے سرمائے میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ خدا کرے یہ قبولِ عام حاصل کرے۔ آمین!

تسنیم

۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء

ابو الفصاحت جناب جوشؔ ملسیانی کے گوہر بار قلم سے ۔

یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ پنڈت جوالا پرشاد شاہیؔ جنہیں ذوقِ سخن گوئی ودیعت میں ملا ہے۔ اپنا مجموعۂ کلام شائع کرنے والے ہیں۔ میں نے اظہار رائے کیلئے انکے کلام کا کچھ اقتباس دیکھا بھی ہے۔ وہ نظم۔ غزل۔ قطعہ۔ رباعی۔ سب کچھ کہنے پر قادر ہیں۔ جو کچھ لکھتے ہیں بہت صاف اور سلیس زبان میں لکھتے ہیں۔ اندازِ بیان میں بھی کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی۔ خیالات بہت پاکیزہ ہیں۔ رنگِ قدیم کی عریانیاں ان کے کلام میں کہیں نظر نہیں آتیں۔ انکے بہت سے اشعار میں عالمگیر افادیت کے پہلو پائے جاتے ہیں۔ مثال میں یہ دو تین شعر کافی ہیں۔

جو مصیبت سے کبھی دست وگریباں نہ ہوا — اُسکو راحت کا میسّر کبھی ساماں نہ ہُوا

اے دلِ خیالِ ترکِ محبت بجا سہی — لیکن مجالِ ترکِ محبت نہیں مجھے

تیرا غم بھی جسے نصیب نہیں — اُس کو دنیا میں آسرا کیا ہے

تینوں شعر ہر پہلو اور ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہیں۔ زمانۂ حال کی مقبول شاعری کا رخ بھی یہی ہے۔ ان میں مفہوم کی وسعت بھی ہمہ گیر ہے۔ زبان بھی بہت شُستہ اور فصیح ہے۔ اندازِ بیان کی دلکشی مزید برآں۔ خدا کرے کہ اس کلام کی اشاعت اُردو زبان کی بہترین خدمت متصور ہو اور اہلِ نظر دل کھول کر اس کی داد دیں۔

— (جوشؔ ملسیانی)

جناب ساگر نکودری کی رائے گرامی :۔

محترم شاہی صاحب! نیازمندی۔

آپ کا خط فردوسِ نظر ہوا۔ کاش میں آپ کے کلام پر جی بھر کر تبصرہ کر سکتا۔ ہائے میری تقدیر، میں ایسا نہ تھا۔ تاہم بھی قدرت نے دوستی کی لاج رکھنے کے لئے مجھ سے پانچ سات شعر آپ کے کلام سے متعلق کہلوا دیئے۔ انہیں پر اکتفا کریں۔

(ساگر)

نظر سے جسکی بھی گزرا کلام شاہی کا
وہ ہو گیا دل و جاں سے غلام شاہی کا

خدا کرے کہ بڑھے قدر اسکی دنیا میں
خدا کرے کہ ہو اونچا مقام شاہی کا

کلامِ شاہی میں گنجائشِ کلام نہیں
بہت بلند ہے فن میں مقام شاہی کا

خلوص و مہر و مروت ہے انکی رگ رگ میں
مئے وفا سے ہے لبریز جام شاہی کا

وہ انکا ہو گیا اک بار جو ملا ان سے
نہ بھول کر کبھی بھولا وہ نام شاہی کا

ہر ایک بحر ہے ادنیٰ کنیز شاہی کی
ہر ایک قافیہ دیکھا غلام شاہی کا

کلامِ شاہی میں پائیں گے آپ زورِ قلم
قلم میں دیکھو گے زورِ کلام شاہی کا

جگہ سر آنکھوں پہ دو تم بھی اِسکو اے ساگر
خُلوصِ دل سے کرو احترام شاہی کا

ساگر نکودری

۹ جنوری ۱۹۷۴ء

مرحوم ساگر صاحب کی شاید یہ آخری تحریر ہے جو اس نیک نہاد کے قلمِ فطرتِ رقم سے میرے مجموعۂ کلام "شعلۂ آواز" پر سپردِ قرطاس ہوئی۔ خداوندِ مطلق مرحوم کی روح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

شاہی

نباّضِ سخن جناب پنڈت رام کرشن مُضطرؔ کے کلکِ گوہر بار سے:۔

جناب جوالا پرشاد شاہیؔ پنجاب کے نمایاں، مقبول اور ممتاز شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی کا شعور جھلکتا ہے۔ اور نئے دور کی آواز سنائی دیتی ہے۔

جناب شاہیؔ کا مجموعہ کلام "شعلۂ احساس" اب سے سولہ برس پیشتر شائع ہوا تھا جسے ادبی حلقوں میں قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ شاہیؔ نے شعر و ادب کی فضا میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی۔ آپ پنجاب کے نامور شاعر سیّد القلم پنڈت یوگی راج نظرؔ سوہانوی کے قریب کے رشتے سے بھتیجے ہوتے ہیں جنکی منظوم گیتا کا درجہ بہت بلند ہے۔ حضرتِ نظرؔ کی سرپرستی میں شاہیؔ کے ذوقِ سخن کو تربیت ملی اور فروغ حاصل ہوا۔ جناب شاہیؔ مستقل مزاج نیک طینت اور فرض شناس انسان ہیں۔ ان کی علمی استعداد مسلّمہ ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کا ہیڈ سیکشن میں کام کرتے ہیں اور اپنے اعلیٰ اوصاف و اطوار سے ہر دلعزیز ہیں۔
جناب شاہیؔ کی شاعری میں حب الوطنی۔ انسان دوستی۔ قربانی و ایثار۔ حق پرستی اور اخلاص و محبت کے پاکیزہ جذبات۔ احساسات اور تاثرات ملتے ہیں۔ ان کی نظم "بیداری" ان کے جذبوں اور خیالوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ "تاج محل" پر اکثر شعراء نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے نظمیں کہی ہیں۔ جناب شاہیؔ کی یہ قطعہ بند

نظم بھی سنئے جس میں حسن و جمال کی عکاسی کا کمال نظر آتا ہے۔

آج شاہ جہاں نہیں لیکن — نور افشاں ہے اُسکے دل کا کنول
قصرِ فردوس کل ہے عکسِ جمیل — لوگ کہتے ہیں جس کو تاج محل
حسنِ بے مثل کا نمونہ ہے — اِس کا شفاف و مرمریں آنچل
لب جمنا پیامِ مہر و وفا — دے رہا ہے جہاں کو تاج محل
سنگِ مرمر کی خواب گیں تصویر — ساری دُنیا میں جس کی شہرت ہے
اہلِ دِل کیلئے حقیقت میں — تاج اِک پیکرِ محبت ہے
ہر قدم پر جلائے ہیں برسوں — چشمِ پُرنم سے آنسوؤں کے دیئے
رہِ روِ منزلِ محبت نے — رُوحِ مُمتاز کی خوشی کیلئے
اے محبت کی یادگارِ حسیں — تجھ پہ نازاں ہیں آسمان و زمیں
تیرے جلوؤں سے روشنی پا کر — ذرّے بھی بن گئے ہیں مہرِ مُبیں

شاہی غزل بھی بڑے اہتمام اور بندوبست کے ساتھ کہتے ہیں لیکن وہ قدامت اور روایت کا شکار نہیں۔ ان کی غزلوں میں جدت۔ تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ وطن پرستی۔ قومی عزائم اور جہد و عمل کی بات ان کی غزل کے شعروں میں بھی ہے۔ شاہی کے یہاں غم و یاس نہیں نشاط و اُمید اور قوت و حیات کا تذکرہ ہے۔ لیجئے اب جناب شاہی کے اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

جس نے اک بار محبت کی نظر سے دیکھا — اُس پہ قربان دلِ زار کیا ہے ہم نے
دیکھ کر پیار کی نگاہوں سے — ہر گلہ دور کر دیا تُو نے
کوئی بھی میرے پاس ہو کہ نہ ہو — آپ کا غم ضرور ہوتا ہے
ستمرانی بہت دلچسپ ہوتی — وفا کا رنگ اگر ہوتا جفا میں
یہ آہیں بھر رہا ہے کون شاہی — قیامت کی حرارت ہے ہوا میں
کیوں تمنا کروں مسرت کی — ساتھ غم لے کے جب حیات آئی
جو ملا غم وہ پائیدار ملا — جو خوشی آئی بے ثبات آئی
کوئی پرسانِ حالِ دل نہ ملا — لاکھ انسان نگاہ سے گزرے
چمن کی تازہ بہاروں کو لوٹنے والو — بہار ہی پہ خزاں چھا گئی تو کیا ہوگا

کروں اس کی قدرِ ذرا نہ کیوں، تیرا درد پھر تیرا درد ہے
میرے دل کو چھوڑ کے آج تک جو ادھر گیا نہ ادھر گیا

گزر رہا ہوں مصائب سے اس لئے شاہی — کہ حادثے بھی ضروری ہیں زندگی کیلئے

اور آخر میں پیشِ خدمت ہے یہ غزل

خلوص و مہر و محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں
بشر کے پاس یہ دولت نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ کیا کہ جبرِ مسلسل سے لوگ پس جائیں
اگر نظام میں حکمت نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہزار دولت و ثروت ہو پاس اے شاہی
جو دل میں صبر و قناعت نہیں تو کچھ بھی نہیں

رام کرشن مضطر ایم۔ اے
روزانہ اخبار "ملاپ" نئی دھلی
یکم جنوری ۱۹۷۳ء

غزلیات

یہ آہیں بھر رہا ہے کون شاہی
قیامت کی حرارت ہے ہوائیں

○

تجھی کو غمگسارِ زندگانی ہم سمجھتے ہیں
تجھی کو اپنے ہر اِک راز کا محرم سمجھتے ہیں

محبت لاکھ پردوں میں ہو پنہاں رہ نہیں سکتی
مگر اِس راز کو اہلِ محبّت کم سمجھتے ہیں

ادائے بے نیازی بے نیازی ہو نہیں سکتی
اِشارے صاف ہیں کیوں آپ اِنہیں مبہم سمجھتے ہیں

جفاؤں کی نئی تمہید ہے یہ بے رُخی اُن کی
مگر نا فہم ان باتوں کو اکثر کم سمجھتے ہیں

نشاطِ زندگی کی آرزو وہ کیوں کریں اے دل
نشاطِ زندگی کو جو دلیلِ غم سمجھتے ہیں

رہا کرتے ہیں نظروں میں تمہارے حُسن کے جلوے
وہی جلوے جنہیں ہم زینتِ عالم سمجھتے ہیں

زبانِ اشک سے شاہی جسے کہتے ہو رُک رُک کر
تُمہاری سرگذشتِ دل ہے اِس کو ہم سمجھتے ہیں

۱۹ر جنوری ۱۹۶۰ء

محبت نے نیرنگ کیا کیا دکھائے — کبھی رو دیئے ہم کبھی مسکرائے
محبت بڑے صبر کا امتحاں تھی — کبھی حرفِ شکوہ زباں پر نہ لائے
حوادث نے ہر سُو کیا خیر مقدم — مگر پائے ہمّت نہیں ڈگمگائے
محبّت سے پہلے ہمیں کب خبر تھی — جو اپنے ہیں بن جائینگے وہ پرائے
ترے غم کی دولت میسّر ہو جسکو — اُسے اور شئے راس آئے نہ آئے
نہ بھولیں گی فُرقت کی تاریک راتیں — سِتاروں کو ہم نے فسانے سنائے
بچا کر نگاہیں حقیقت سے شاہی — فریبِ نظر ہم نے دانستہ کھائے

رقص کرتے ہیں پھول شاخوں پر
جب عُروسِ بہار گاتی ہے
باغ کی نغمہ زار پہلی سحر
کیف و مستی میں ڈوب جاتی ہے

۲۸ نومبر ۱۹۶۱ء

O

چمن کا حُسن ہے دو روز کا دوام نہیں
نظر فریب نظاروں کو کچھ قیام نہیں
یہ ظُلم و جور خزاں کے ارے معاذ اللہ
گُلوں کے چہرے پہ رنگینیوں کا نام نہیں
قدم قدم پہ ہیں جبر و ستم کے ہنگامے
رہِ حیات میں امن و سکوں کا نام نہیں
یہ پُوچھنا ہے مجھے وقت کے خُداؤں سے
فساد و جنگ کی کیوں آج روک تھام نہیں
زمانے بھر کے پِلانے کو خُم کے خُم ساقی
ہمارے نام کا اِک میکدے میں جام نہیں
سرِ نیاز کے ہمراہ دل جو خم نہ ہُوا
کچھ اور ہوگا وہ سچ رہ نہیں سلام نہیں
وطن پرست حقیقی نہیں وہ لے شاہی
جنہیں وطن کی بہاروں کا احترام نہیں

۱۲ دسمبر ۱۹۶۱ء

ہمکو غم کی وہ چوٹ سہنی ہے — زندگی بھر جو یاد رہنی ہے
جانے کس کس کے ظلم اٹھانے ہیں — جانے کس کس کی ہمکو سہنی ہے
ظلم کا آسرا نہ لے کے چڑھو — پیڑ نازک ہے نرم ٹہنی ہے
مجھکو ٹالو نہ جھوٹے وعدوں پر — صاف کہدو جو بات کہنی ہے

سارا عالم تڑپ اُٹھے شاہیؔ
وہ غزل آج ہمکو کہنی ہے

۸ر فروری ۱۹۶۲ء

تیرے غم میں جو مبتلا نہ ہُوا — وہ مسرت سے آشنا نہ ہُوا
تیرے جلوؤں کی روشنی میں تجھے — دیکھ لینے کا حوصلا نہ ہُوا
رہ روِ منزلِ محبت کا — کوئی بھی درد آشنا نہ ہُوا
اُن سے وعدہ خلافیوں کا گِلہ — جن سے وعدہ کبھی وفا نہ ہُوا
اہلِ لطف و کرم کی جانب سے — کونسا غم ہمیں عطا نہ ہُوا
جا کے اُنکے حضور بھی شاہیؔ — لب شناسائے مدعا نہ ہُوا

یکم اپریل ۱۹۶۳ء

○

حُسن کی آب و تاب نے مارا — عشق کے اضطراب نے مارا
دلِ فُرقت زدہ کا حال نہ پُوچھ — دوست کے اجتناب نے مارا
ساری دُنیا سے اسکو وحشت ہے — دلِ خانہ خراب نے مارا
روز و شب کیوں نصیحتیں واعظ — اس عذاب و ثواب نے مارا
عہدِ پیری میں ہمکو اے شاہی — آرزوئے شباب نے مارا

یکم اپریل ۱۹۶۳ء

○

دَرد سے دل کو سجھ دیا تُو نے — مجھکو ممنُون کر دیا تُو نے
دیکھ کر پیار کی نگاہوں سے — ہر گِلہ دُور کر دیا تُو نے
کبھی سوچا کہ میری اُلفت کا — بے وفا کیا ثمر دیا تُو نے
اَے مرے حُسن لبس کے نظروں میں — دِل کو پُر نور کر دیا تُو نے
آج بزمِ سُخن میں اے شاہی — سب کو مسحور کر دیا تُو نے

○

سُرمئی شام کی بہاروں میں — آرزوؤں کے پھول کھلتے ہیں
تیرے جلوے سمٹتی ہے نظر — جس گھڑی دونوں وقت ملتے ہیں

خلوص و مہر و محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں
بشر کے پاس یہ دولت نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ کیا کہ جبرِ مسلسل سے لوگ پس جائیں
اگر نظام میں حکمت نہیں تو کچھ بھی نہیں

کسی کی آنکھ کے تنکوں کو دیکھنے والے
تری نگاہ میں وسعت نہیں تو کچھ بھی نہیں

وطن میں ایسے بھی عزت فروش ہیں کچھ لوگ
جو کل یہ کہتے تھے عزت نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہزار دولت و ثروت ہو پاس اے شاہی
جو دل میں صبر و قناعت نہیں تو کچھ بھی نہیں

برق بن کر جو دل پہ لہرائی
تیرے جلووں کی ہے وہ رعنائی

سب جسے انقلاب کہتے ہیں
میرے احساس کی ہے انگڑائی

یہ زبان و بیاں کی رعنائی
تیرے ہر لفظ میں ترنم ہے

تو نہیں ہے اگر تو محفل میں
کچھ بھی ہو بے مزہ تکلم ہے

۱۷ اپریل ۱۹۶۳ء

اونچا یوں دہر کا معیار کیا ہے ہم نے
ریگ زاروں کو چمن زار کیا ہے ہم نے

اس کے ہر وار کو سینے میں جگہ دے دے کر
نگہِ ناز کو سوفار کیا ہے ہم نے

اپنی ہستی کو مٹایا ہے تجسس میں ترے
تجھ کو اے دوست نمودار کیا ہے ہم نے

جس نے اک بار محبت کی نظر سے دیکھا
اس پہ قربان دلِ زار کیا ہے ہم نے

ٹھوکریں کھا کے ملے ہیں ہمیں منزل کے نشاں
راہِ دشوار کو ہموار کیا ہے ہم نے

حق نوائی کی خطا ہم سے ہوئی ہے پہلے
پھر طوافِ رسن و دار کیا ہے ہم نے

درد میں ڈوبے ہوئے شعر سنا کر شاہی
دلِ احباب کو سرشار کیا ہے ہم نے

آسماں کی بساط پر اے دوست
رقص کرتے ہیں اس طرح تارے
جیسے دریائے زندگی میں کوئی
پار اترنے کو دست و پا مارے

۲۸ جولائی ۱۹۶۳ء

O

جب بشر پر غرور ہوتا ہے
آدمیت سے دور ہوتا ہے

مئے عرفان و آگہی کے طفیل
دل میں کیف و سرور ہوتا ہے

کوئی بھی میرے پاس ہو کہ نہ ہو
آپ کا غم ضرور ہوتا ہے

دل کے داغوں کا عکس ہے ورنہ
کب ستاروں میں نور ہوتا ہے

خشک ہوتا ہے خونِ دل شاہی
تب غزل کا ظہور ہوتا ہے

O

غم سے جو ہمکنار ہو نہ سکا
وہ کبھی کامگار ہو نہ سکا

جسکو خاروں سے پیار ہو نہ سکا
وہ چمن پُر بہار ہو نہ سکا

سعی ہر کامیاب ہوتی ہے
شوق کیوں کامگار ہو نہ سکا

پاسِ وعدہ ضرور کرتے وہ
ہمکو ہی اعتبار ہو نہ سکا

کب کسی کا وہ بن سکے گا رفیق ؟
اپنا جو غمگسار ہو نہ سکا

لاکھ چاہا سنائیں اُنکو مگر
حالِ دل آشکار ہو نہ سکا

ہم بھی چاہا کیے مگر شاہی
قیدِ غم سے فرار ہو نہ سکا

مسرت عظمتِ آدم نہیں ہے — وہ انساں کیا ہے جسکو غم نہیں ہے
نہ ہو اس کی خبر تمکو تو قسمت — تمہاری یاد کب پیہم نہیں ہے
ہُوا ہے تجربہ ہمکو تو اتنا — محبت موت سے کچھ کم نہیں ہے
اُنڈیلے جام رے ساغر میں ساقی — یہ ساغر جامِ جم سے کم نہیں ہے
بپا ہیں ہر طرف کیوں انقلابات — نگاہِ دوست تو برہم نہیں ہے
تمہارے حُسن کی تو بات ہی کیا — ہمارا عشق بھی کچھ کم نہیں ہے
ہیں اُنکے جلوے تو ہر سمت شاہی — ہماری ہی نظر میں دم نہیں ہے

ہو کے سُود و زیاں سے بیگانہ — زندگی کا سکون پایا ہے
میں نے تسکینِ تشنگی کے لئے — کتنا خونِ جگر پلایا ہے

رقص میں عشرتوں کے جام رہے — ایک ہم تھے جو تشنہ کام رہے
بے نیازی انہیں سے اے ساقی — عمر بھر جو ترے غلام رہے

○

محبت آگئی ہے کس فضا میں ۔۔۔ صدا اٹھی سی ہے دل کی صدا میں
ستمرانی بہت دلچسپ ہوتی ۔۔۔ وفا کا رنگ اگر ہوتا جفا میں
حنا میں ایسی رنگینی کہاں تھی ۔۔۔ ہمارا خون تھا رنگِ حنا میں
بھروسے میں دغا کا رنگ کیسا ۔۔۔ یہ خوئے رہزنی کیوں رہنما میں
جبیں خود سرکشوں کی جھک رہی ہے ۔۔۔ کشش کتنی ہے اُنکے نقشِ پا میں
پشیماں میں بھی ہوں اپنی خطا پر ۔۔۔ تری رحمت بھی شامل ہے خطا میں
اگر ہو مانگنے کا کچھ سلیقہ ۔۔۔ مراد آجائے خود دستِ دعا میں
نگاہِ لطف سے دیکھا یہ کس نے ۔۔۔ تڑپ سی ہے دلِ حسرت زدہ میں

یہ آہیں بھر رہا ہے کون شاہی
قیامت کی حرارت ہے ہوا میں

○

کیف پرور نظر کے پڑتے ہی ۔۔۔ روح مستی میں ڈوب جاتی ہے
کتنی دلکش ہے زندگی جس میں ۔۔۔ آرزو تیری مسکراتی ہے

○

جنوں فروش بہار آ گئی تو کیا ہو گا
جہانِ ہوش پہ لہرا گئی تو کیا ہو گا

چمن کی تازہ بہاروں کو لوٹنے والو
[illegible] پہ خزاں چھا گئی تو کیا ہو گا

نقابِ حسن دو عالم الٹ تو دوں لیکن
[illegible] پہ برق سی لہرا گئی تو کیا ہو گا

قدم قدم پہ نظاروں کا رقصِ پیہم ہے
نظر نظر سے جو ٹکرا گئی تو کیا ہو گا

زبانِ اشک سے کہتے ہو داستاں شاہی
جو سن کے موت بھی گھبرا گئی تو کیا ہو گا

○

برق لہرا رہی ہے گلشن پر
شعلے رقصاں ہیں آشیانے میں

حوصلے دیکھ سخت جانوں کے
جی رہے ہیں نرے زمانے میں

○

جانِ حسنِ بہار ہیں ہم لوگ
رشکِ صد لالہ زار ہیں ہم لوگ

تجھکو معلوم ہی نہیں شاید
عاشقی کا وقار ہیں ہم لوگ

○

نشانِ جبر و ستم کے مٹائے ہیں ہم نے
ستم گروں کے کرم آزمائے ہیں ہم نے

قدم قدم پہ جو ظلمتکدے تھے اے ہمدم
وفا کے نور سے وہ جگمگائے ہیں ہم نے

عروجِ قوم کی منزل رہی ہے پیشِ نظر
چراغِ امن و محبت جلائے ہیں ہم نے

نئی حیات نئی منزلیں نئے رہرو
نئے جہان کے نقشے بنائے ہیں ہم نے

ہر ایک لفظ کو خونِ جگر سے لکھا ہے
زبانِ دل سے فسانے سنائے ہیں ہم نے

ہوائے تند کے جھونکے جنہیں اُڑا نہ سکے
چمن میں ایسے نشیمن بنائے ہیں ہم نے

تڑپ اٹھیں گے جنہیں سُن کے اہلِ دل شاہی
وطن کی راہ میں وہ گیت گائے ہیں ہم نے

۱۳ر دسمبر ۱۹۶۳ء

○

تجھ سے ثابت ہے دوستی سب کی　　تجھ سے روشن ہے زندگی سب کی

آپ کو کب کسی نے پہچانا؟　　رہ گئی کھل کے آگہی سب کی

آپ کو کیا بنا لیا اپنا　　مول لے لی ہے دشمنی سب کی

قافلے لٹ گئے سرِ منزل　　دیکھ لی ہم نے رہبری سب کی

خوب تقسیم تُو نے یہ کی ہے　　روشنی اُن کی تیرگی سب کی

دل لگانے کے جھوٹے وعدے ہیں　　دیکھتا ہوں میں دل لگی سب کی

کیوں زمانہ خلاف ہے تم سے　　دشمنی لے نہ آدمی سب کی

میرے ہی آشیاں نے جلنا تھا؟　　اس میں سازش ضرور تھی سب کی

اس کا انجام کیا ہوا شاہی
عمر بھر تم نے قدر کی سب کی

۵ر فروری ۱۹۶۴ء

تیری پہلی گرم نگاہی کا کبھی عمر بھر نہ اثر گیا
کئی داغ دِل پہ اُبھر گئے اگر ایک زخم بھی بھر گیا

کبھی یہ جِگر میں سما گیا، کبھی آ کے دِل میں اُتر گیا
یہ نہ پُوچھ مجھ سے کہاں کہاں ترا تیرِ حُسنِ نظر گیا

کروں اِسکی قدرِ وفا نہ کیوں، تیرا درد پھر تیرا درد ہے
میرے دِل کو چھوڑ کے آج تک جو اِدھر گیا نہ اُدھر گیا

تیری زندگی ہے شگفتگی، تجھے اپنی مستی سے ہے غرض
تُو سمجھ رہا ہے کہ سیلِ غم میرے سر سے یُونہی گزر گیا

جِسے لوگ کہتے ہیں سب وفا وہ وفا تھی کوئی خطا نہ تھی
یہ مرے نصیب کی بات ہے کہ یہ جُرم میرے ہی سر گیا

تجھے یہ گماں تھا نحیف ہوں، مجھے تاب لانا محال ہے
میرے حوصلوں پہ جو کی نظر ترے غم کا چہرہ اُتر گیا

یہ معاملات ہیں عشق کے اِنہیں شاہی کیسے بیاں کروں
کسی بزمِ ناز میں عمر بھر میں کبھی نہ جاتا مگر گیا

۷ مارچ ۱۹۶۴ء

یہ کیا کہ لوگ پریشان ہیں خُوشی کے لئے
جہاں میں غم کی ضرورت ہے زِندگی کے لئے

زباں پہ ہے ترا ذکر، دِل میں یاد تیری
اب اور چاہیئے کیا مُجھکو زندگی کے لئے

سوالِ ترکِ تمنّا بہت گراں ہے مگر
یہ زہر بھی میں پیوں گا تری خُوشی کے لئے

یہ اُودی اُودی گھٹائیں یہ سرد سرد ہوا
پیام غیب سے آئے ہیں مَے کشی کے لئے

گزر کے پھُول اِسی منزِل سے خاک ہوتا ہے
پیامِ مرگ، تبسّم نہ ہو کلی کے لئے

تمہارے درد کی نا اہل قدر کیا کرتے
یہ راس آتی ہے دولت کسی کسی کے لئے

نہاں بھی ہوتے ہیں خنجر کُچھ آستینوں میں
بڑھاؤ ہاتھ نہ ہر اِک سے دوستی کیلئے

گزر رہا ہوں مصائب سے اِس لئے شاہی
کہ حادثے بھی ضروری ہیں زِندگی کیلئے

۱۲، مارچ ۱۹۶۴ء

عزم جس کا جواں نہیں ہوتا — وہ کبھی کامراں نہیں ہوتا
جسکو عرفانِ زندگی ہے اُسے — فکرِ نام و نشاں نہیں ہوتا
سامنے اُنکے اشک بہتے ہیں — حالِ دِل کا بیاں نہیں ہوتا
جس پہ لہرا کے بجلیاں نہ گریں — وہ کوئی آشیاں نہیں ہوتا

حُسنِ فکر و نظر نہ ہو جب تک
شاعرِ خوش بیاں نہیں ہوتا

۲۸ر جون ۱۹۶۴ء

آ گئی جب زباں پہ بات آئی — رقص میں دل کی کائنات آئی
کیوں تمنّا کروں مسرت کی — ساتھ غم لے کے جب حیات آئی
دیکھ کر مجھکو اشک بھر آئے — جوش پر چشمِ التفات آئی
یاد بھی اُن کی کیا قیامت ہے — سینکڑوں لے کے حادثات آئی
اپنا انجام تھا نگاہوں میں — خون روتی ہوئی حیات آئی
جو مِلا غم وہ پائیدار مِلا — جو خوشی آئی بے ثبات آئی

اب بتاؤ کروگے کیا شاہی
نہیں جس کی سحر وہ رات آئی

۲۵ر جولائی ۱۹۶۴ء

○

شدتِ جلوہ سے دیوانہ بنایا ہوتا — کاش اپنا ہی مجھے افسانہ بنایا ہوتا
زندگی کر دی ہے دشوار انہیں نے یا رب — اِن خرد مندوں کو دیوانہ بنایا ہوتا
سجدہ ریزی کی مصیبت سے تو یہ تھا بہتر — مجھے سنگِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
توبہ کے بعد بھی مے نوشی حسیں ہو جاتی — ظرفِ مہتاب کو پیمانہ بنایا ہوتا
تیری قسمت میں تو اے شیخ نہیں تھی رندی — اپنے مشرب ہی کو رندانہ بنایا ہوتا
زیست پھر دردِ مجسم تو نہ بنتی یا رب — عشق کو موت کا پروانہ بنایا ہوتا

خیر سے مست نظر جھک گئی اُٹھ کر شاہیؔ
اُس نے تو بزم کو دیوانہ بنایا ہوتا

○

جب سے دیکھی ہے آپکی تصویر — دید کی آرزو ہے دامن گیر
ہم نے اپنا بنا لیا اُن کو — دیکھیے اب دکھائے کیا تقدیر
ہر نظر کو فریب دیتی ہے — اُف! یہ کاجل کی آنکھ میں تحریر
تیری زُلفوں کی چھاؤں میں اکثر — ہم نے دیکھی ہے حُسن کی تنویر

شاہیؔ اُن کا سلام آیا ہے
آج شاید بدل گئی تقدیر

۲۹ر اگست ۱۹۶۴ء

○

غم فزا ہجر کی یہ رات خدا خیر کرے
دیکھئے پہنچے کہاں بات خدا خیر کرے

دل میں ہے سوزِ نہاں آنکھ سے آنسو ہیں رواں
اُنکی اُلفت کی یہ سوغات خدا خیر کرے

اے مرے ہوش بتا تیرا ارادہ کیا ہے
اُن سے ہے پہلی ملاقات خدا خیر کرے

دیکھئے جا کے رُکے گردشِ ایام کہاں
خود ہی حیران ہیں حالات خدا خیر کرے

بادہ کی نہریں تو اب شیخ کے گھر بہتی ہیں
تشنہ ہیں اہلِ خرافات خدا خیر کرے

آج رُکتے ہی نہیں اشک مری آنکھوں سے
آج زوروں پہ ہے برسات خدا خیر کرے

غم کے سایوں میں سسکتے ہیں اندھیرے ہر سُو
کتنی پُر ہول ہے یہ رات خدا خیر کرے

دوست کہتے ہیں کرو ترک محبت شاہی
ہم نہیں مانیں گے یہ بات خدا خیر کرے

۸ر۲ر۱۱ ۱۹۶۴ء

○

جو تُم گئے تو نظاروں سے دوستی کرلی　　دِل و نظر کے سہاروں سے دوستی کرلی
کمال ہے مِرے عزمِ بلند کی جرأت　　قدم بڑھایا ستاروں سے دوستی کرلی
یہ کیا کہ تُو نے محبت کا خون کرڈالا　　بدلتے وقت کے دھاروں سے دوستی کرلی
غمِ فراق مٹانے کی تھی یہی صورت　　غمِ فراق کے ماروں سے دوستی کرلی
مزہ تو تب تھا کہ طوفاں سے کھیلتا شاہیؔ　　یہ کیا کیا کہ کناروں سے دوستی کرلی

۳۰ر اکتوبر ۱۹۶۴ء

○

غمِ ہستی سے جب نجات ملی　　اُترا چہرہ لئے حیات ملی
رہ روِ منزلِ محبت کو　　دوست کے غم کی کائنات ملی
جب سے دِل میں بسے ہیں وہ آکر　　جُستجو سے ہمیں نجات ملی
جب جُھکائی جبینِ شوق کہیں　　سامنے دیرِ سومنات ملی

یہ بھی اپنا نصیب ہے شاہیؔ
نہیں جس کی سحر وہ رات ملی

۲۰ر نومبر ۱۹۶۴ء

○

اُف! یہ عالم تری بے رُخی کا — رنگ اُڑنے لگا زندگی کا

خیر سے مِل گیا آپ کا غم — کچھ ٹھکانا نہیں ہے خوشی کا

تیرے ظلم و ستم کے تصدق — بڑھ گیا حوصلہ عاشقی کا

سامنے آپ کا در نہیں ہے — مُدعا کیا ہے اِس بندگی کا

بن کے ناصح مِرے دوستوں نے — نام رُسوا کیا دوستی کا

جل رہے ہیں سب اپنی لگی میں — کوئی کھاتا نہیں غم کسی کا

وقت کیسا یہ آیا ہے یا رب — آدمی ہے عُدو آدمی کا

ظُلمتِ شب نہ اب رہ سکے گی — دَور آیا ہے اب چاندنی کا

سازِ غم پر غزل خوانیِ شاہی — یہ کرم ہے فقط آپ ہی کا

○

یاد کا تیری اب یہ عالم ہے
یاد کرنے پہ بھی نہیں آتی
اور جب خود بخود وہ آتی ہے
مدتوں دِل سے پھر نہیں جاتی

محبّت حاصلِ کون و مکاں ہے
محبّت آدمیّت کا نشاں ہے

محبّت محرمِ رازِ نہاں ہے
محبّت دو دِلوں کی ترجماں ہے

محبّت کے محیطِ بیکراں میں
ہماری زیست کی کشتی رواں ہے

نہ ہو اِس کی خبر تجھکو تو قسمت
تو ہی دِل میں تو ہی وِردِ زباں ہے

کبھی وہ شعلہ و شبنم میں ظاہر
کبھی وہ آتشِ گُل میں نہاں ہے

سہارا کیا مِلے جینے کا اُن کو
محبّت جنکو مرگِ ناگہاں ہے

نثار اُن پیار کی نظروں کے شاہی
جنہیں غیروں پہ اپنوں کا گُماں ہے

یکم دسمبر ۱۹۶۴ء

یوں تو دَر اَور بھی ہیں دُنیا میں
تیرے دَر کا مگر جواب نہیں
میری جھولی ہی تنگ ہے ورنہ
تیری بخشش کا کچھ حساب نہیں

○

نالہ و اشک و آہ سے گزرے — ہم تیری بارگاہ سے گزرے
زندگی بھر اسی کو رونا ہے — پیار کی جس نگاہ سے گزرے
جستجو میں تمہارے دیوانے — منزلِ نجم و ماہ سے گزرے
کوئی پرسانِ حالِ دل نہ ملا — لاکھ انساں نگاہ سے گزرے
پاؤں بڑھ کر لئے مسرت نے — جب غمِ بے پناہ سے گزرے
ہر قدم ہنستے کھیلتے شاہی — ہم مصائب کی راہ سے گزرے

۲۲ فروری ۱۹۶۵ء

○

عشق میں اپنی جان سے گزرے — ہم بڑی آن بان سے گزرے
مسکرا کر وفا پرست ترے — ہر کڑے امتحان سے گزرے
جب بھی غیرت پہ حرف آنے لگا — ہم بصد شوق جان سے گزرے
کیا مسرت سے تن گئے سینے — لے کے غم جب جہان سے گزرے

جیسے ارجن کے بان ہوں شاہی
بول ایسے زبان سے گزرے

۲۷ اپریل ۱۹۶۵ء

مہ و نجوم کی دُنیا حسین ہے کتنی
حیاتِ نو کی تمنّا حسین ہے کتنی

تصوّرات کی دُنیا حسین ہے کتنی
تجلّیِ پسِ پردہ حسین ہے کتنی

وہ جسکے دَم سے ہے سرسبز گُلستانِ وطن
حیات بخش یہ گنگا حسین ہے کتنی

ہر ایک ذرّہ پہ ہے نقشِ پا کنہیّا کا
زمینِ گوکُل و متھرا حسین ہے کتنی

قدم قدم پہ نظاروں کی دلکشی توبہ
نظر نظر کی تمنّا حسین ہے کتنی

رہا ہے روزِ ازل سے یہ پاسبانِ وطن
فصیلِ کوہِ ہمالہ حسین ہے کتنی

غمِ حیات سے پائی نجات اے شاہی
یہ شعر و نغمہ کی دُنیا حسین ہے کتنی

موسمِ گُل میں سازِ ہستی پر!
تُو اگر نغمہ بار ہو جائے!
رقص کرنے لگے عُروسِ بہار
ہر طرف لالہ زار ہو جائے

۲۵ مئی ۱۹۶۵ء

○

قدم قدم پہ نظاروں کی دِلکشی لوں گا　　نظر نظر سے بہاروں کی تازگی لوں گا
گلوں کے ناز اٹھانے کی مجھکو تاب نہیں　　فریبِ حسنِ بہاراں ہی کھا کے جی لوں گا
جو تو نے مست نظر سے عطا کیا تھا کبھی　　وہ رنگ و نور کا اِک جام اور بھی لوں گا
مرے جنوں نے کیا تار و تار جو دامن　　اُسے تمہارے ہی تارِ نظر سے سی لوں گا

۷ر جون ۱۹۶۵ء

○

مستِ حسنِ شباب ہوتے ہیں
آپ اپنا جواب ہوتے ہیں
نرم و نازک یہ خوشنما غنچے
جب کبھی بے نِقاب ہوتے ھیں

○

ترے رُوئے مُنوّر کی ضِیا سے　　اندھیرے جگمگانا چاہتا ہوں
ترے قدموں میں نقدِ جاں لٹا کر　　سُراغِ زیست پانا چاہتا ہوں

○

جس کا اپنا چلن ہی نیک نہیں
خاک ہوگا وہ کامیاب کہیں

عیش و آرام جاں اگر ہے کہیں
وہ ہے ہندوستاں کی پاک زمیں

جو درخشاں ہے تیرے جلووں سے
دل کی لیتی ہے وہ جمیل و حسیں

ہمکو باغ ارم سے کیا مطلب
ہمکو اپنا وطن ہے خلد بریں

ایک میں ہوں کہ جس نے تیرے لئے
ق
ذلتیں سینکڑوں خوشی سے سہیں

ایک تو ہے کہ جس نے میرے لئے
مشکلیں ہر قدم پہ پیدا کیں

بن گئی ہے بذات خود کعبہ
انکے نقش قدم پہ آکے جبیں

جستجو ہے اگر یہی شاہی
ڈھونڈ لوں گا انہیں کہیں نہ کہیں

۱۷ر جون ۱۹۶۵ء

○

بکھرے ہوئے ہیں جلوے تری جلوہ گاہ میں
دیکھے کوئی یہ تاب کہاں ہے نگاہ میں

یارب جو غم دیا ہے تو دے صبر بھی مجھے
کس چیز کی کمی ہے تری بارگاہ میں

دنیائے سرخوشی کی تمنائیں کیوں کروں
حاصل ہے مجھکو عیش غمِ بے پناہ میں

بے تابیٔ جبیں کا سہارا یہی تو ہے
سجدے لٹا رہا ہوں میں تیری راہ میں

پروائی جب چلی ہے تو چمکی ہیں بجلیاں
ہوتے ہیں کچھ شرر بھی نہاں سرد آہ میں

مہر و وفا کی بات کوئی دل لگی نہیں
لگتی ہے جی کی، جان کی بازی نباہ میں

شاہی ہر اِک نظر میں کھٹکنے لگا ہوں میں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

۲۷ر جون ۶۵ ۱۹ء

O

حُسنِ فِطرت کے نظاروں کی طرف تو دیکھو
دِیدہ و دِل کے سہاروں کی طرف تو دیکھو

مِٹ گئے شوق میں جو قوم و وطن کی خاطر
دیکھو اُن چاند ستاروں کی طرف تو دیکھو

خُون ہر پھُول پہ اُبھرا ہے مِرے ارماں کا
صحنِ گُلشن میں بہاروں کی طرف تو دیکھو

زِندگی بھُوک سے بے حال و پریشاں ہے بہت
اُن کے دعدوں کے سہاروں کی طرف تو دیکھو

کشتیِ شوق کو دیتے نہیں دامن میں جگہ
بحرِ ہستی کے کناروں کی طرف تو دیکھو

بڑھتے آتے ہیں تلاطُم کی طرح اے شاہی
قُلزمِ زیست کے دھاروں کی طرف تو دیکھو

۱۲ ، مارچ ۱۹۶۶ء

○

چراغِ مہر و محبت جلا رہا ہے کوئی
جہانِ قلب و جگر جگمگا رہا ہے کوئی

وطن کی راہ میں خود کو مٹا رہا ہے کوئی
حیاتِ اصل کی منزل پہ آ رہا ہے کوئی

روش روش پہ بہاروں کا رنگ روپ لئے
کلی کلی کے جگر میں سما رہا ہے کوئی

قدم قدم پہ سرور آفریں نگاہوں سے
شرابِ ناب کے ساغر لنڈھا رہا ہے کوئی

جبینِ شوق جھکائے ہوئے نیاز کے ساتھ
کسی کی راہ میں سجدے لٹا رہا ہے کوئی

جنون و ہوش کی دنیا میں حشر برپا ہے
وہ رنگ و نور کے دریا بہا رہا ہے کوئی

ہے انتظار مجھے جس کے آنے کا شاہی
خبر کرو اسے، دنیا سے جا رہا ہے کوئی

۵، جولائی ۱۹۶۶ء

(۱)

وہ رات عیش و مسرت کی رات ہوتی ہے
کہ جس میں آپ کے آنے کی بات ہوتی ہے

عروجِ عشق کی نیرنگیاں، جزاک اللہ
نئی حیات نئی کائنات ہوتی ہے

تمہارے حسن کے جلوؤں کی روشنی پا کر
قدم قدم پہ منور حیات ہوتی ہے

خیالِ دوست میں جھکتا ہے سر جہاں میرا
وہی زمین مجھے سومنات ہوتی ہے

عجیب اس کا مقدر ہے اس کو کیا کہیے
قدم قدم پہ محبت کو مات ہوتی ہے

علاجِ غم تو بجز موت کچھ نہیں شاہیؔ
کسے حیات میں غم سے نجات ہوتی ہے

۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۶ء

○

آرزو آلام سے ٹکرا گئی
گردشِ ایّام سے ٹکرا گئی

میری توبہ ٹوٹنے کی ہے صدا
یا صُراحی جام سے ٹکرا گئی

محفلِ ساقی میں ہر پیاسی نظر
بے اِرادہ جام سے ٹکرا گئی

لڑکھڑا کر بارِ غم سے زندگی
شورشِ آلام سے ٹکرا گئی

گُلشنِ ہستی میں دانے کی تلاش
طائروں کو دام سے ٹکرا گئی

منزلِ مقصود شاہیؔ خود بہ خود
بڑھ کے میرے گام سے ٹکرا گئی

۳۱ر اکتوبر ۱۹۶۶ء

○

حیات بخش نظارے بلا رہے ہیں تمہیں
تڑپتے سجدے ہمارے بلا رہے ہیں تمہیں

فروغِ حسنِ چمن جنکے دم سے ہے قائم
وہ رنگ و نور کے دھارے بلا رہے ہیں تمہیں

قدم قدم پہ جنہیں رہبروں نے لوٹا ہے
وہی نصیب کے مارے بلا رہے ہیں تمہیں

وطن کی پاک محبت کا واسطہ دے کر
وطن میں درد کے مارے بلا رہے ہیں تمہیں

سرِ نیاز جھکاتے ہوئے وہ اے شاہی
وفا پرست تمہارے بلا رہے ہیں تمہیں

○

نقاب رخ سے ہٹاؤ بہت اندھیرا ہے
چراغِ حسن جلاؤ بہت اندھیرا ہے

ضیائے حسنِ چمن جنکے دم سے تھی قائم
وہ پھول ڈھونڈ کے لاؤ بہت اندھیرا ہے

نفس نفس ہے شمیمِ بہار جنکا ندیم
انہیں کہیں سے بلاؤ بہت اندھیرا ہے

جفا و جور کی پرہول رہگزاروں میں
وفا کی شمع جلاؤ بہت اندھیرا ہے

جگر کے داغوں نے بخشی ہے روشنی جسکو
وہ چاند فرش پہ لاؤ بہت اندھیرا ہے

یوں شامِ غم کی سیاہی نہ جائیگی شاہی
سلگتا جام اٹھاؤ بہت اندھیرا ہے

تیرے دَم سے حیات باقی ہے
رونقِ کائنات باقی ہے

حالِ دِل اُن سے کہہ گئے آنسو
پھر بھی کہنے کی بات باقی ہے

اب تو چہرے کا رنگ اُڑنے لگا
چارہ گر، کتنی رات باقی ہے

خاک میں مِل کے پھر کھِلے گا پھُول
مَوت میں بھی حیات باقی ہے

فکرِ دنیا سے گو میں فارغ ہوں
پھر بھی فکرِ نجات باقی ہے

مہرِ تاباں طلوع تو ہو بھی چکا!
پھر بھی لگتا ہے رات باقی ہے

سب ہیں فانی نہیں کسی کو بقا
صرف خالق کی ذات باقی ہے

دل کی بستی اُجڑ گئی تنہا ہی
دَرد کی کائنات باقی ہے

○

وفا کے نور سے دل جگمگائے جائیں گے
یہ جبر و جور کے شعلے ہمیں بجھائیں گے

کریں گے جب وہ نظر دہر کی دورنگی پر
مری وفا کے چلن اُن کو یاد آئیں گے

اندھیرے رات کے اے دوست رہ سکیں گے کہاں
ابھی سحر کے اُجالے انہیں مٹائیں گے

زباں کے نام پہ تخریب کاریاں توبہ
کِسے خبر تھی یہ گُل بھی کھلائے جائیں گے

رہِ وفا میں کسی دوست کے لئے شاہی
دِل و جگر کے خزانے لٹائے جائیں گے

۲۵ر جنوری ۱۹۶۸ء

○

غمِ دوست میں حل ہُوا جا رہا ہوں
اِسی راہ پر بے خطا جا رہا ہوں

عجب ہے سُرورِ محبت کا عالم
فضاؤں میں ہر دم اُڑا جا رہا ہوں

تمہاری جفائیں نہیں ہیں نظر میں
وفاؤں پہ اپنی مِٹا جا رہا ہوں

بڑے ہیں مِری رِفعتوں کے ارادے
زمیں سے فلک پر اُڑا جا رہا ہوں

ترے روئے تاباں کے جلووں میں ڈھلکر
سراپا تجلّی بنا جا رہا ہوں

۱۱ر فروری ۱۹۶۸ء

○

کسی کے جورِ پیہم کا گلہ کیا — محبت میں بھلا کیا اور بُرا کیا
ہمارا دِل ہی جب اپنا نہیں ہے — ہماری آرزو کیا مُدّعا کیا
دُھواں سا اُٹھ رہا ہے کیوں چمن میں — نشیمن آتشِ گُل سے جلا کیا؟
ہمیں اپنا وطن خُلدِ بریں ہے — تری جنت سے ہمکو واسطا کیا
گراں خوابی کو چھوڑ اے جوانو — وطن کی راہ میں خوفِ فنا کیا
ہمیں نسبت ہے تیرے آستاں سے — ہماری سرخوشی کی انتہا کیا

ہم اپنے دل کے ہاتھوں ہی لُٹے ہیں
نگاہِ دوست کا شاہی گلا کیا

○

میرے مُشفق تجھے مبارک ہو
جلوۂ سالِ نو کا رنگِ بہار
تُو رہے شاد کام صبح و شام
پُر مسرت ہوں تیرے لیل و نہار

اس طرح دل غمی سے ملتا ہے — جیسے وہ زندگی سے ملتا ہے
اس کو کہیے بلندیِ اخلاق — جب کوئی عاجزی سے ملتا ہے
خون ہوتا ہے باوفائی کا — جب کوئی بے رخی سے ملتا ہے
سب کو دیکھا یہاں اسیرِ غرض — کون ورنہ کسی سے ملتا ہے
خوفِ اظہارِ حسن کا عالم — دل گرفتہ کلی سے ملتا ہے
سو تکلف نثار ہوتے ہیں — جب کوئی سادگی سے ملتا ہے
ملیے یوں سب سے جیسے اے شاہی — آدمی آدمی سے ملتا ہے

۱۹؍مارچ ۱۹۶۹ء

قدم قدم پہ گلستاں کھلا رہا ہے کوئی — بہارِ حسنِ دو عالم پہ چھا رہا ہے کوئی
پھر آیا ہوش ذرا سا کسی کی یاد آئی — گماں یہ ہوتا ہے دل کو کہ آ رہا ہے کوئی
تصورات کے عکسِ جمیل سے اے دوست — جہانِ عشق میں جنت سجا رہا ہے کوئی
زبانِ اشک سے رودادِ درد و غم اپنی — سنا سنا کے کسی کو رلا رہا ہے کوئی

امید و وہم کا جادو ہے ورنہ اے شاہی
نہ آ رہا ہے کوئی اور نہ جا رہا ہے کوئی

جو مُنہ آپ کا صُبحدم دیکھتے ہیں
کسی اَور کو پھر وہ کم دیکھتے ہیں

جنہیں زورِ بازو پہ اپنے یقیں ہے
وہ اپنے مُقدّر کو کم دیکھتے ہیں

جُھکا دیتے ہیں ہم جبینِ عقیدت
"جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں"

اسیرانِ دردِ محبّت کسی کے
ستم میں بھی شانِ کرم دیکھتے ہیں

ہماری وفا کو تمہاری جفا کو
نہ تُم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

تری کیف پرور نگاہوں کے صدقے
سرورِ بہارِ ارم دیکھتے ہیں

محبت کی غمناک دُنیا میں شاہیؔ
ہمیں جانتے ہیں جو ہم دیکھتے ہیں

۱۴ر اپریل ۱۹۶۹ء

جنکو رہِ حیات میں پاسِ وفا نہیں
وہ آدمی ہو کچھ بھی مگر کام کا نہیں

اپنے دل و نظر سے نہ ہمکو گرائیے
ہم میں ہزار عیب سہی بے وفا نہیں

پردے میں جو دلوں کے دغا دے سکیں ندیم
کچھ اور ان کو کہیئے مگر رہنما نہیں

گو ہم پہ ظلم ڈھائے ہیں انہوں نے بے شمار
لیکن کسی کے جور کا شکوہ کیا نہیں

میں نے یہ کب کہا کہ بڑے بے وفا ہو تم
دنیا یہ کہہ رہی ہے کہ تم با وفا نہیں

جب بھی ملا ہمیں وہ ملا بے رُخی کیساتھ
اللہ رے حسنِ ظن کہ وہ ہم سے خفا نہیں

ہیں غمگسارِ قوم و وطن اور بھی یہاں
شاہیؔ سا غمگسار مگر دُوسرا نہیں

۲۵ر اپریل ۱۹۶۹ء

○

سینکڑوں جلوے لئے جب وہ نمایاں ہونگے — ماہ و انجم کیطرح ذرّے درخشاں ہونگے
جب چمن زارِ محبت میں وہ رقصاں ہونگے — پھول تو پھول ہیں غنچے بھی غزلخواں ہونگے
کیا خبر تھی کہ اسیرِ غمِ دوراں ہونگے — جاں نثارانِ وطن یوں بھی پریشاں ہونگے
کیسے کیسے یہاں صد چاک گریباں ہونگے — ق — ایسے ویسے یہاں ہمدوشِ سلیماں ہونگے
زندگی پھوٹ کے روئے گی ہو کے آنسو — لوگ حالاتِ زمانہ سے ہراساں ہونگے
جنکے دم سے تھی گلستانِ وطن کی زینت — کیا خبر تھی وہی محرومِ بہاراں ہونگے
ہو نہ مایوس کبھی رحمتِ باری سے کوئی — آج مغموم ہیں جو کل وہی شاداں ہونگے
روحِ احساس تڑپ اُٹھے گی سنکر اے دوست — جب بھی ہم سازِ غمِ دل پہ غزلخواں ہونگے

فرض ادا کرتے ہیں شاہوں کی طرح اے شاہی
سامنے ہم نہ کسی کے بھی پشیماں ہوں گے

۱۱ رمئی ۱۹۶۹ء

○

ویرانے کو گلزار بنانا سیکھو — ماحول کو ہموار بنانا سیکھو
مجبور کے حالات پہ رونے والو — مجبور کو مختار بنانا سیکھو

○/

نہ ملے نہ پھول تو کانٹوں سے دوستی کرلی
چمن میں ہم نے بسر یوں بھی زندگی کرلی

جمالِ دوست کے جلووں کی ٹھنڈی کرنوں سے
جہانِ عشق و محبت میں روشنی کرلی

قدم قدم پہ اسیرانِ دردِ الفت نے
تمہارا نام لیا اور بندگی کرلی

ہمارے دل کی سبھی آرزوئیں خاک ہوئیں
ہمارے دوست نے کیسی یہ بے رُخی کرلی

توقع جن سے تھی ہر گام رہبری کی ہمیں
نظر بچا کے انہوں ہی نے رہزنی کرلی

زمانہ گائے نہ کیوں سازِ دل پہ میری غزل
کہ میں نے نغمہ گری جزوِ شاعری کرلی

زمانہ لینے لگا اب قدم مرے شاہیؔ
کسی کی راہ میں پامال جب خودی کرلی

۲۱ مئی ۱۹۶۹ء

تو محبت کی جان ہے پیارے — تیرا شیدا جہان ہے پیارے
میرے دل کی زبان ہے پیارے — سب کی جو ترجمان ہے پیارے
سب پہ ارزاں ہیں تیرے لطف و کرم — کچھ ہمارا بھی دھیان ہے پیارے
مسکرا کر نہ جس سے ہم گزرے — کون سا امتحان ہے پیارے
جور کرنا بھی اب تو چھوڑ دیا — اتنا کیوں بدگمان ہے پیارے
مرحلے سر کرینگے ہم بڑھ کر — عزم اپنا جوان ہے پیارے
جاں نثارانِ قوم کے دم سے — ق ملک کی آن بان ہے پیارے
داد لیتی ہے یہ حریفوں سے — اردو دلکش زبان ہے پیارے

شاہی کو تیرے در سے نسبت ہے
تو ہی میرا جہان ہے پیارے

۱۱ر جون ۱۹۶۹ء

وہ جل دیئے ہیں محبت میں آشناؤں نے
کہ ہر قدم پہ لہو رو دیا وفاؤں نے
وہ جنکو موجِ تلاطم بھی غرق کر نہ سکی
ڈبو دیا اُنہیں ساحل پہ ناخداؤں نے
کسی کے جور و ستم کا گلہ نہیں ہمدم!
مجھے تباہ کیا میری ہی وفاؤں نے
کسی کی چشمِ سرور آفریں کا کیا کہنا
معافی مانگ لی توبہ سے پارساؤں نے
خدا کے نام پہ انسان بٹ گئے باہم
دکھائے معجزے کیا مذہبی خداؤں نے
بڑھے کچھ اور مرے گام جانبِ منزل
فریب گرچہ دیئے خوب رہنماؤں نے
ہوائے تند کے طوفاں بدوش جھونکوں کا
مزاج بدلا ہے شاہی مری نواؤں نے

۱۲ر جون ۱۹۶۹ء

○

جب سے پایا تری بے رُخی کا پتہ — ڈھونڈتا پھر رہا ہوں خوشی کا پتہ
بارہا ہنس کے ٹکرائے ہیں موت سے — تب مِلا ہے کہیں زندگی کا پتہ
اپنی محرومیوں کا گِلہ کیا کریں — دِل کو ہے آپ کی بے بسی کا پتہ
اُن اندھیروں پہ بھی پیار کی اِک نظر — دے رہے ہیں جو کچھ روشنی کا پتہ
اُن سے احوالِ دِل کا بیاں کیا کریں — جو نہیں جانتے دوستی کا پتہ
اس زمانے میں اے دل کِسے پوچھیئے — کِس کو معلوم ہے آدمی کا پتہ

لوگ حیرت سے مُنہ میرا تکنے لگے
پُوچھا شاہیؔ جو مَیں نے کِسی کا پتہ

۱۰ر جولائی ۱۹۶۹ء

○

اب وہ پہلی سی جُستجو نہ رہی — دِل میں کوئی بھی آرزو نہ رہی
بس گئے اُنکے جلوے آنکھوں میں — اَب تمنائے رنگ و بُو نہ رہی
اُنکی آنکھوں میں اَشک بھر آئے — جب انہیں تابِ گفتگو نہ رہی
اب گریباں رہا نہ وہ دامن — حاجتِ زحمتِ رفو نہ رہی
کب کِسی دوست کا کرم نہ ہوا — خون کب ہو کے آرزو نہ رہی
کِس زباں سے بیاں کریں شاہیؔ — اب وہ اُردو کی آبرو نہ رہی

○

بہت ہیں بہت اے زمانے بہت ہیں — تری گردشوں کے فسانے بہت ہیں

ترے آستانے سے اٹھتا نہیں سر — نگاہوں میں گو آستانے بہت ہیں

جلائے گی کس کس کو اے برقِ سوزاں — چمن زار میں آشیانے بہت ہیں

زمیں تو زمیں آسماں چھان مارا — سنا تھا تمہارے ٹھکانے بہت ہیں

ہماری وفا کے، تمہاری جفا کے — زبانِ جہاں پر فسانے بہت ہیں

بڑا قحط ہے دوستی کا جہاں میں — مگر دوستی کے فسانے بہت ہیں

ابھی سے اجل کس طرح آئے شاہی — ابھی ہمکو صدمے اٹھانے بہت ہیں

۳۰ر ستمبر ۱۹۶۹ء

○

زندگی کا وہ آسرا تو نہیں — بتِ کافر کوئی خدا تو نہیں

اپنی منزل کی راہ کا کانٹا — آدمی خود ہے دوسرا تو نہیں

ہم سے کیوں آپ ہو گئے برہم — ہم نے کچھ آپ سے کہا تو نہیں

بے نوائی کوئی برائی ہے؟ — بے نواؤں میں بے وفا تو نہیں

دل میں طوفانِ درد برپا ہے — کہیں شاہی غزل سرا تو نہیں

۷ر فروری ۱۹۷۰ء

آپ کو جب قریب پاتا ہوں　　ساری دُنیا کو بھول جاتا ہوں
داغِ قلب و جگر جلاتا ہوں　　چاند تاروں کو جگمگاتا ہوں
غرقِ دریائے بے خودی ہو کر　　زندگی کا سُراغ پاتا ہوں
ہر نفس تیرے عہدِ رنگیں میں　　زخم کھاتا ہوں مسکراتا ہوں
غمِ محبوب کی نوازش ہے　　میں جو تازہ حیات پاتا ہوں
نظرِ دوست جب سے بدلی ہے　　اپنی نظروں سے گرتا جاتا ہوں

دوستی کا بُرا ہو اے شاہیؔ
دُشمنوں کے بھی ناز اٹھاتا ہوں

۱۶ر جون ۱۹۷۰ء

حُسن خود بیں عجیب ہوتا ہے　　آپ اپنا رقیب ہوتا ہے
خود ہی دُشمن ہے آدمی اپنا　　خود ہی اپنا حبیب ہوتا ہے
جو ہے محرومِ نعمتِ غم سے　　وہ کہاں خوش نصیب ہوتا ہے
تشنگی دل کی دُور ہوتی ہے　　جب وہ میرے قریب ہوتا ہے
جس پہ تیری نظر نہیں پڑتی　　وہ بڑا کم نصیب ہوتا ہے
جس کو پاسِ ادب نہ ہو شاہیؔ　　وہ کہاں کا ادیب ہوتا ہے

۱۷ر ستمبر ۱۹۷۰ء

○

جانِ محفل جب نظر آتا نہیں دَور مے بھی دِل کو بہلاتا نہیں
ظلمتِ شب کے جگر کو کاٹ دو اب اندھیروں میں رہا جاتا نہیں
ان سے امیدِ وفا اے ہمنوا جنکو اسلوبِ وفا آتا نہیں
غرقِ بحرِ بے خودی جو ہو گیا وہ فریبِ زندگی کھاتا نہیں
آستانِ پاک سے اُس دوست کے
لوٹ کر خالی کوئی جاتا نہیں

یکم دسمبر ۱۹۷۱ء

○

دیکھ کر اُن کے لبِ گلابی سے ہو گئے آج ہم شرابی سے
حسرتیں اَور بھی ہوئیں بیدار اُنکی آنکھوں کی نیم خوابی سے
چاندنی سی جہاں میں پھیل گئی اُنکے چہرے کی جلوہ تابی سے
تشنۂ غم پہ قہر ٹوٹ پڑا اُنکی مجلس میں باریابی سے
دِل پہ بجلی سی گر گئی شاہی
اُن کے جلوؤں کی بے حجابی سے

۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء

○

آہ لب پر ہے آنکھ پُرنم ہے
دِل کا عالم عجیب عالم ہے

مہر نابود ہے وفا کم ہے
زِندگی شعلۂ جہنّم ہے

خونِ دِل رو رہا ہے ہر غنچہ
گلستاں میں یہ کس کا ماتم ہے

مل رہی ہے گلے اَجل سے حیات
اب مریضِ وفا کو کیا غم ہے

زِندگی زخم ہی سہی اے دوست
زِندگی خود ہی اِس کا مرہم ہے

کس کو ہم مونسِ حیات کہیں
کون اپنا جہاں میں محرم ہے

دیکھ کر حالِ غم نصیبوں کا
دِلِ ہر اِنساں کا پیکرِ غم ہے

آپ سمجھے ہیں زِندگی جسکو
یہ عناصر کا ربطِ باہم ہے

کتنا خوش بخت ہے وہ اَے شاہی
جسکی قسمت میں عِشرتِ غم ہے

۲۳ر دسمبر ۱۹۷۱ء

○

یقین جنکو نہیں اِنقلاب لانے میں — فراغ انکو نہ حاصل ہُوا زمانے میں

بہاریں پھوٹ کے روتیں نظامِ گلشن پہ — لگائی آگ کسی نے جب آشیانے میں

بھڑک رہے ہیں ہر اِک سمت بُغض کے شعلے — اماں کا کوئی بھی گوشہ نہیں زمانے میں

سُنا رہے ہیں کسی کے ستم کے افسانے — وہ چار تنکے جو باقی ہیں آشیانے میں

خُدا نہ چاہے اگر جنگ چھڑ گئی شاہی

کسر نہ چھوڑیں گے ہم ظلم کے مِٹانے میں

۲۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء

○

پھر حسرت و ارمانِ جبل لے کے اُٹھو

ہمراہ حَسیں عزم و عمل لے کے اُٹھو

اب جابرِ و ظالم کو مِٹانا ہے تمہیں

تلواروں میں پوشیدہ اَجل لے کے اُٹھو

جب مسرت قریب آئی ہے   غم کا تازہ پیام لائی ہے
ہر نفس ہے قیامتِ پیہم   اے محبت تری دُہائی ہے
خرمنِ دِل کا اب خُدا حافظ   اس نے برقِ نظر گرائی ہے
کون آیا ہے میکدہ بر دوش   بے خودی سی فضا پہ چھائی ہے
جُستجو میں نکل پڑے آنسو   پھر مجھے تیری یاد آئی ہے

غم سلامت رہے تِرا شاہیؔ
مَیں نے تازہ حیات پائی ہے

نظر آپ کی جب اِدھر ہو گئی   شبِ دردو غم کی سحر ہو گئی
ہر اِک ذرّہ خاک دِل بن گیا   جہاں کی ہر اک شے نظر ہو گئی
شبِ غم نہ اپنی ہوئی مختصر   مگر زندگی مختصر ہو گئی
غمِ دوست تیرا بہت شکریہ   بہت ہی خوشی سے بسر ہو گئی

نظر اُٹھ گئی اُن کی شاہیؔ جدھر
معاً ساری دُنیا اُدھر ہو گئی

پیار کے آنسو آنکھ سے ڈھلکے   جیسے مے کے ساغر چھلکے
پھولوں کو عرفان ہُوا ہے   کانٹوں کی آغوش میں پلکے
ارماں دل کے اور بڑھے ہیں   کانٹوں کے رستے پہ چل کے
تیرا کوچہ میرا کعبہ   اس میں جلوے حسنِ ازل کے
جونہی یاد تمہاری آئی   میری آنکھ سے آنسو ڈھلکے
راہبروں سے بچ کر رہنا   رہزن آئے بھیس بدل کے
چاہے جتنا آئیں حوادث   کھلیں گے جوہر عزم و عمل کے
بعد مرے روئیں گے لہو وہ   پچھتائیں گے ہاتھ کو مل کے
ناہموار ہے دنیا شاہیؔ
اِسمیں چلنا ذرا سنبھل کے

۲۰ر جولائی ۱۹۷۲ء

آگہی کی بات کرتے جایئے   میری روشن رات کرتے جایئے
درد و غم سے رنج سے آفات سے   بڑھ کے دو دو ہاتھ کرتے جایئے

خیالِ دوست کو دل سے جُدا نہیں کرتے — یہ جُرم اہلِ محبت کیا نہیں کرتے
وفا کی اوٹ میں مشقِ جفا نہیں کرتے — خدا گواہ کہ ہم یہ خطا نہیں کرتے
فریبِ حسنِ نظارہ دیا نہیں کرتے — کہ امتحانِ نظر یوں لیا نہیں کرتے
غمِ حبیب کی دولت نصیب ہو جنکو — وہ آرزوئے مسرت کیا نہیں کرتے
نظر سے پیتے ہیں بزمِ سرور و مستی میں — وہ پارسا جو بظاہر پیا نہیں کرتے
نظر میں جنکی ہویدا ہے آج کا چہرہ — وہ لوگ کل پہ بھروسہ کیا نہیں کرتے
ہوائے تُند کے طوفاں بدوش جھونکوں میں — چراغ مہر و محبت بُجھا نہیں کرتے
دغا کا دخل ہے کیوں آپکے بھروسے میں — یہ رہزنی تو کبھی رہنما نہیں کرتے

رہِ وفا میں جو ثابت قدم ہیں اے شاہی
وہ ظلم و جور کے آگے جھکا نہیں کرتے

اب ذکر کیا خودی کا، خود کو مٹا رہا ہوں — عرفان و آگہی کی منزل پہ آ رہا ہوں
طوفانِ بحرِ غم کو پیہم شکست دیکر — کشتیِ آرزو کو ساحل پہ لا رہا ہوں
جلوے تمہارے یوں تو آنکھوں میں پھر رہے ہیں — دھوکا ہے یہ نظر کا پیہم جو کھا رہا ہوں
دنیا کی گردشیں پھر آئیں مقابلہ کو — پھر جامِ زندگی کو گردش میں لا رہا ہوں
یہ شان ہے تمہاری یہ ہے کرم تمہارا
ناکام زندگی کی میت اٹھا رہا ہوں

وہ قوم و وطن میں جسکو مٹ جانا نہیں آتا — اسے اے دل مقامِ زندگی پانا نہیں آتا
وہی انسان غازی ہے وہی ہے عزم کا مالک — ہجومِ یاس و غم میں جسکو گھبرانا نہیں آتا
یہ مانا بیکس و نادار ہوں لیکن زمانے میں — کسی کے سامنے بھی ہاتھ پھیلانا نہیں آتا
مرا سر جھک نہیں سکتا کبھی جبر و تشدد سے — عدو کی دھمکیوں سے مجھکو ڈر جانا نہیں آتا
گزر اوقات کر لیتا ہوں ہر حالت میں اے شاہی
مجھے چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

جس گھڑی محفل میں اُنکو روبرو پاتا ہوں میں | زندگی کے عالمِ رنگیں میں کھو جاتا ہوں میں

روح بنکر جب ہر اِک شے میں سما جاتا ہوں میں | مُسکراتا آپکو پیشِ نظر پاتا ہوں میں

کیا قیامت ہے الٰہی یہ ہجُومِ یاس و غم | حلقۂ دورِ حوادث میں گھِرا جاتا ہوں میں

کشتیٔ امیدؔ لے کر بحرِ احساسات میں | ڈوب جاتا ہوں کبھی ساحل پہ آ جاتا ہوں میں

کیجے کس سے گلہ، کیسا زمانہ آ گیا | مہربانوں کو بھی اب نا مہرباں پاتا ہوں میں

ڈال کر بحرِ فنا میں کشتیٔ عمرِ رواں | موجِ دریا سے کبھی ساحل سے ٹکراتا ہوں میں

لُٹ گئی اپنی متاعِ زندگی یہ کیا ہُوا! | دِلکو شاہیؔ محشرستانِ فغاں پاتا ہوں میں

اُنکے کوچہ میں مر گئے ہیں ہم | عِشق کا نام کر گئے ہیں ہم

آپ کا غم بھی ساتھ رہا | زندگی میں جدھر گئے ہیں ہم

شدتِ دردِ غم ارے توبہ! | زندگی سے گزر گئے ہیں ہم

آتشِ حسن و عشق میں جل کر | اُور بھی کچھ نکھر گئے ہیں ہم

ہر قدم پر اجل کو للکارا | حادثوں میں جدھر گئے ہیں ہم

کسی جانب چلے ہوں ہم شاہیؔ
درِ دلدار پر گئے ہیں ہم

○

ادائے فرضِ مقدم ہے آدمی کیلئے　　سمجھ کہ علمِ الٰہی ہے آگہی کیلئے
حرم میں دَیر میں سجدے گزارنے والو　　صفائے قلب ضروری ہے بندگی کیلئے
بصد خلوص وطن پر نثار ہو جاؤ　　یہی ضرور ہے تابندہ زندگی کیلئے
اُسی کے نور سے روشن ہیں مہر و ماہ شاہیؔ
وہی چراغ ہے دُنیا کی روشنی کیلئے

○

حیات بخش نظاروں کی جستجو ہے مجھے　　ترے کرم کے سہاروں کی جستجو ہے مجھے
چمن چمن میں بہاروں کی جستجو ہے مجھے　　نظر نواز نظاروں کی جستجو ہے مجھے
سما سکیں جو رگِ جاں میں روح بن بنکر　　کچھ ایسے تازہ نظاروں کی جستجو ہے مجھے
رہِ حیات میں دشوارئ سفر تو بڑا　　قدم قدم پہ سہاروں کی جستجو ہے مجھے
مٹا سکیں جو یہ تاریکیٔ جہاں شاہیؔ
زمیں پہ ایسے ستاروں کی جستجو ہے مجھے

○

جو مصیبت سے کبھی دست و گریباں نہ ہوا — اُس کو راحت کا میسّر کبھی ساماں نہ ہوا

دردِ دل سُن کے کسی کا جو پریشاں نہ ہُوا — آدمی ہو کے بھی وہ آدمی انساں نہ ہوا

وقتِ مشکل بھی جو مشکل سے ہراساں نہ ہوا — کونسا عقدۂ مشکل اسے آساں نہ ہوا

ہر لبِ زخم سے گو ہم نے پکارا اُس کو — نہ ہوا کوئی مگر دید کا ساماں نہ ہُوا

جس کے سر میں نہیں، عشق کا سودا شاہیؔ
وہ فرشتہ بھی اگر ہو مگر انساں نہ ہوا

○

جہانِ رنگ و بُو کی داستاں کچھ اور کہتی ہے — اسیرانِ حوادث کی فغاں کچھ اور کہتی ہے

لگی ہے آگ گلشن میں کسی کے گرم نالوں سے — چمن کے غنچے غنچے کی زباں کچھ اور کہتی ہے

تڑپ کر رہ گئی آہِ دلِ مظلوم سینے میں — ستمگر کی نگاہِ [illegible] کچھ اور کہتی ہے

سکونِ قلب حاصل ہو جہاں میں کیا بھلا شاہیؔ
کہ جب یہ سوزشِ دورِ جہاں کچھ اور کہتی ہے

الٰہی یہ کیا قہرِ برقِ تپاں ہے — کہ سارا چمن صرفِ آہ و فغاں ہے
یہ کیا انقلابِ زمان و مکاں ہے — نہ وہ منزلیں ہیں نہ وہ کارواں ہے
عجب داستاں ہے مری زندگی کی — مری زندگی بھی عجب زندگی ہے
مرے دل کے حالات کیا پوچھتے ہو — مرے دل کو حاصل غمِ دو جہاں ہے
ستم اور کیا ڈھائے گی برقِ سوزاں — نہ وہ گلستاں ہے نہ وہ آشیاں ہے
مرے ضبط کی داد دے اے ستمگر — نہ آنکھوں میں آنسو نہ لب پر فغاں ہے
گری تھی کبھی جس پہ لہرا کے بجلی — وہ میرا چمن ہے مرا آشیاں ہے
ترے دل سے پیہم صدا سن رہا ہوں — مجھے یہ بتا تو سہی تو کہاں ہے

وہ ہر شعر پر ہنس کے کہتے ہیں شاہیؔ
کہ تو واقعی ایک جادو بیاں ہے

نور برسا اور فضاؤں میں چراغاں ہو گیا — ذرہ ذرہ راہ کا مہرِ درخشاں ہو گیا
باغِ ہستی کی بہاروں کا بیاں کیا کیجئے — باغ ہی اپنا اجڑ کر آج ویراں ہو گیا

تیری ناکامی ہی شاہیؔ زندگی کا راز ہے
اپنی ناکامی سے پھر کیوں تو پریشاں ہو گیا

وہ جلوے ساتھ لیکر بے شمار و بے حجاب آیا
جہانِ دیدہ و دل میں بہ شکلِ آفتاب آیا

نکل کر آج بدلی سے ہمارا ماہتاب آیا
اُمنگوں پر بہار آئی امیدوں پر شباب آیا

ہزاروں بجلیاں کوندیں ہزاروں آندھیاں اٹھیں
کلی کے مسکراتے ہی نہ جانے کیوں عذاب آیا

وہ رشکِ ماہ اے شاہیؔ مرے گھر چاندنی شب میں
رُخِ روشن پہ ڈالے زُلفِ مشکیں کا نقاب آیا

زباں کا لوچ ہے رنگینیٔ بیاں کیلئے
بہ اہتمام ہے ترتیبِ داستاں کیلئے

شبِ فراق جو تھمتے نہیں مرے آنسو
ملا ہے سیلِ الم چشمِ خونچکاں کیلئے

سکونِ دل بھی حاصل نہ ہو سکا تجھکو
ستم اٹھائے تھے کیا کیا نشاطِ جاں کیلئے

سرِ نیاز میں اتبک ہزار سجدۂ شوق
تڑپ رہے ہیں ترے سنگِ آستاں کیلئے

گلے جو ملتی ہے عشاق سے سرِ مقتل
تڑپ رہا ہوں اُسی تیغِ خونفشاں کیلئے

یہ جورِ بادِ حوادث ارے معاذ اللہ
کہ ایک تنکا بھی چھوڑا نہ آشیاں کیلئے

بصد خلوص دیا میں نے نعرۂ لبیک
اُٹھی نگاہ کسی کی جو امتحاں کیلئے

وفا کے نور سے روشن ہے کل جہاں شاہیؔ
وفا چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے

○

جو بے خزاں ہو تو ایسی بہار پیدا کر — نہ مٹ سکے جو کبھی وہ وقار پیدا کر
جو عرش و فرش میں اک زلزلہ بپا کر دے — دل و نگاہ میں وہ اضطرار پیدا کر
ہر ایک دل ہو ترے جذبِ دل کا آئینہ — خلوصِ قلب سے وہ اعتبار پیدا کر
تری تلاش میں خود جلوۂ صنم نکلے — وہ رنگ، وہ نگہِ انتظار پیدا کر

تری نظر ہے پرستارِ حق اگر شاہی
ربابِ دل میں محبت کا تار پیدا کر

○

زندگی تیری یہ ادا کیا ہے — راحت و غم کی انتہا کیا ہے
اپنا سایہ بھی جب نہیں اپنا — پھر زمانے کا آسرا کیا ہے
اس قدر تم تو ہو گئے برہم — یہ بتاؤ مری خطا کیا ہے
تیرا غم بھی جسے نصیب نہ ہو — اُس کے جینے کا آسرا کیا ہے
پاس اربابِ عشق کے اے دوست — دلِ پُر درد کے سوا کیا ہے

عشقِ صادق کو دہر میں شاہی
آہ و زاری سے واسطا کیا ہے

جسکو پاسِ وفا نہیں ہوتا — وہ کسی کام کا نہیں ہوتا

خاک پائیں گے وہ تمہارا نشاں — جنکو اپنا پتا نہیں ہوتا

شمعِ اُلفت کے جاں نثاروں کو — خوفِ مرگ و بقا نہیں ہوتا

رہروِ منزلِ محبت کا — کوئی بھی رہنما نہیں ہوتا

اپنی ہمت جو ہار جاتے ہیں — اُن کا حامی خُدا نہیں ہوتا

تمہارے کرم کی نظر چاہتا ہوں — دلِ بے اثر میں اثر چاہتا ہوں

اِدھر بھی ہو چشمِ کرم مہرِ تاباں — شبِ درد و غم کی سحر چاہتا ہوں

مجھے آرزوئے سرورِ ابد ہے — تری کیف پرور نظر چاہتا ہوں

جو بزمِ دو عالم کو پُر نور کر دے — خُدا سے وہ حُسنِ نظر چاہتا ہوں

بڑی آرزو سے یہ کہتا تھا شاہیؔ

ترے پیار کی اک نظر چاہتا ہوں

ابھی ترتیبِ عالم میں کمی محسوس ہوتی ہے
کہانی زیست کی بے ربط سی محسوس ہوتی ہے

بکھرتا جا رہا ہے ہستیٔ عالم کا شیرازہ
مسلسل برہمی ہی برہمی محسوس ہوتی ہے

نہ وہ ارماں ہیں دل میں نہ اب وہ ولولے لیکن
ابھی تک پھانس اک چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے

یہ نغمہ کس نے چھیڑا ہے ربابِ دل کے تاروں پر
کہ ہر سو زندگی ہی زندگی محسوس ہوتی ہے

مٹا سکتی ہے جو تاریکیٔ آفاق اے ہمدم
نگاہِ شوق میں وہ روشنی محسوس ہوتی ہے

مسلسل خامشی ہے دیر سے مطرب کے ہونٹوں پر
فضا میں کس لئے پھر تھرتھری محسوس ہوتی ہے

کسی کی سرد مہری کا بیاں کیا کیجئے شاہیؔ
بساطِ زندگی بے نور سی محسوس ہوتی ہے

○

الٰہی کیوں مرے دل کی پریشانی نہیں جاتی
جہاں آباد ہے نظروں کی ویرانی نہیں جاتی

چھپاتے ہیں رخِ پرنور کو وہ لاکھ پردوں میں
نہیں جاتی ہے پھر بھی جلوہ سامانی نہیں جاتی

بڑی مدت ہوئی دیکھا تھا محفل میں تجھے لیکن
مری آنکھوں کی اب تک وہ حیرانی نہیں جاتی

محبت نے خدا جانے کہاں پہنچا دیا مجھکو
کہ خود اپنی ہی صورت مجھ سے پہچانی نہیں جاتی

ادھر اغیار کی ہر بات شاہیؔ مان جاتے ہو
ادھر اک میں ہوں جسکی ایک بھی مانی نہیں جاتی

کیا عہدِ زندگی پہ بھروسا کرے کوئی ‏— دُنیائے بے ثبات میں کیا کیا کرے کوئی
ہو جائے غرقِ بحرِ اَلم کشتیٔ حیات ‏— اور ڈوبتے ہوؤں کا نظارا کرے کوئی
جلوے جمالِ دوست کے دیکھے جو ہر جگہ ‏— وہ حق نگر نگاہ تو پیدا کرے کوئی
جب وہ نگاہِ ناز نہیں مائلِ کرم ‏— پھر کس لئے کرم کا تقاضا کرے کوئی
جب عیشِ زندگی ہے غمِ زندگی کا نام ‏— کیوں عیشِ زندگی کی تمنا کرے کوئی
اے دل کسی کا حسن جب پنہاں نہ رہ سکے ‏— کیوں چشمِ اشتیاق سے پردا کرے کوئی

حالاتِ روزگار ہی شاہی نہ وہ رہے
پھر کیا کسی سے جور کا شکوہ کرے کوئی

علاجِ گردشِ دوراں تلاش کرتا ہوں ‏— سکونِ قلبِ پریشاں تلاش کرتا ہوں
بہارِ حسنِ گلستاں تلاش کرتا ہوں ‏— نشاطِ دید کے ساماں تلاش کرتا ہوں
جنوں نے بڑھ کے جنہیں تار تار کر ڈالا ‏— وہ اپنے جیب و گریباں تلاش کرتا ہوں
جنونِ عشق کی محشر طرازیاں توبہ! ‏— کہ ہر قدم پہ بیاباں تلاش کرتا ہوں

مٹا سکے جو یہ تفریقِ باہمی شاہی
خلوصِ دل سے وہ انساں تلاش کرتا ہوں

○

ٹھوکریں کھاتے ہوئے حسن کے در تک پہنچے
کاش وہ جانِ بہاراں بھی نظر تک پہنچے

دامنِ چشم میں صدہا دُرِ نایاب لئے
سینہ چاکانِ محبت ترے در تک پہنچے

اے کماں دارِ محبت کا تقاضہ یہ ہے
ناوکِ ناز مرے قلب و جگر تک پہنچے

ایک دن جہدِ مسلسل کا ثمر ملتا ہے
غرقِ دریا جو ہوئے لعل و گہر تک پہنچے

دم بدم موجِ حوادث کے تھپیڑے توبہ
کیوں نہیں نالے مرے بابِ اثر تک پہنچے

حسرتِ سجدہ لئے دل میں بصد عجز و نیاز
تیرے دیوانے تری راہ گزر تک پہنچے

شرم کی وجہ سے آجائیں گہن میں شاہی
شہرۂ حسن اگر شمس و قمر تک پہنچے

○

بقیدِ ہوش جلووں کو درخشاں کون دیکھے گا
کسے ہے تاب تیرا روئے تاباں کون دیکھے گا

جھٹک کر جا رہے ہو میرا دستِ آرزو لیکن
ان آنکھوں سے جہانِ دل کو ویراں کون دیکھے گا

چمن میں آمدِ فصلِ بہاراں ہے مگر ہمدم
جنونِ عشق کو صحرا بداماں کون دیکھے گا

وفورِ شوق ہی میں جل بجھیں تیرے پروانے
ترا رونا بتا اے شمعِ گریاں کون دیکھے گا

ہمیں سے باغِ عالم میں یہ رعنائی ہے اے شاہی
نہ ہوں گے جب ہمیں رنگِ گلستاں کون دیکھے گا

جو نظر حق نگر نہیں ہوتی — وہ کبھی معتبر نہیں ہوتی
خاک سمجھیں وہ کائنات کے راز — جنکو اپنی خبر نہیں ہوتی
ایسی چشمِ کرم کو کیا کہیئے — جو مرے حال پر نہیں ہوتی
اے اجل تو ہی کچھ سہارا دے — زندگی اب بسر نہیں ہوتی
اُن کی مجھ پر نہ جانے کیوں شاہیؔ — پیار کی اِک نظر نہیں ہوتی

آپ ہی کا اگر اشارہ ہے — تلخیٔ زیست بھی گوارا ہے
ایک عالم پہ آشکارا ہے — حُسن کو عشق نے سنوارا ہے
زیست کے ہر نئے مسافر کو — راہ کے پیچ و خم نے مارا ہے
زیست کے ڈوبتے سفینے کو — عشق کی موج نے اُبھارا ہے
غمِ محبوب تیری عمر دراز — میرے جینے کا تُو سہارا ہے

کیسا یہ انقلاب ہے شاہیؔ
وہ نظر ہے نہ وہ نظارا ہے

دِل میں ہمّت اگر نہیں ہوتی — کوئی منزل بھی سر نہیں ہوتی
کیسا اندھیر ہے محبّت میں — دِل کو دِل کی خبر نہیں ہوتی
شدّتِ درد و غم کا یہ عالم — ہمکو اپنی خبر نہیں ہوتی
دِل کی گہرائیوں سے جو نکلے — وہ دُعا بے اثر نہیں ہوتی
آنسوؤں کی چمک نہ ہو جس میں — وہ ہنسی معتبر نہیں ہوتی
ہیں جو محوِ خیالِ دوست انہیں — فکرِ شام و سحر نہیں ہوتی
ہو نہ جو آشنائے دِل شاہیؔ — وہ نظر کچھ نظر نہیں ہوتی

چوٹ اپنوں سے دل پہ کھائی ہے — اے محبّت تری دُہائی ہے
جانے کیا ہو گیا زمانے کو — دشمنی دوستی پہ چھائی ہے
کیا مسرت بُھلا سکے گی اُسے — غم کے ہاتھوں جو چوٹ کھائی ہے
گرچہ پہنچے ہیں عرش تک نالے — تیرے در تک کہاں رسائی ہے
اے غمِ دوست تیری عمر دراز — میں نے تازہ حیات پائی ہے
مائلِ لطف ہے کسی کی نظر — زندگی آج مُسکرائی ہے
کس نے ہنگامہ زارِ ہستی میں — قیدِ غم سے نجات پائی ہے
تو نے تڑپا دیئے ہیں دِل شاہیؔ — جب غزل سازِ غم پہ گائی ہے

○

زباں کھولی جونہی ذکرِ آشنا کیلئے — سلامتی کو اٹھے ہاتھ بھی دعا کیلئے
کوئی بھی شئے ہو زمانے میں ہے فنا کیلئے — وجودِ پاک ہی دنیا میں ہے بقا کیلئے
گدا تو از ترے در سے اب کہاں جاؤں — متاعِ صبر و سکوں کر عطا خدا کیلئے
ہر ایک گام پہ پیغامِ امن دو شاہیؔ — زمانہ لاکھ ابھارے تمہیں جفا کیلئے

○

بہارِ حسن کا جلوہ دکھا کے چھوڑ دیا — رخِ جمیل سے پردہ اٹھا کے چھوڑ دیا
کسی کے حسن کی کافرادائیوں نے مجھے — دیارِ عشق میں بسمل بنا کے چھوڑ دیا
جہان بھر کو عطا کی ہیں نعمتیں تو نے — مرا خیال ہی کیوں مسکرا کے چھوڑ دیا
جفائے غیر کا کوئی گلہ نہیں شاہیؔ — تمہیں نے مجھکو تو اپنا بنا کے چھوڑ دیا

○

نظر فریب نظارے تلاش کرتا ہوں — نگاہ و دل کے سہارے تلاش کرتا ہوں
اتر گئے جو نگاہوں سے دل کی دنیا میں — وہی تمہارے اشارے تلاش کرتا ہوں
رہِ حیات میں یہ پست ہمتی تو بہ! — کہ ہر قدم پہ سہارے تلاش کرتا ہوں
بہارِ حسن کی نیرنگیاں معاذ اللہ — جنوں نواز نظارے تلاش کرتا ہوں

مٹا سکیں جو زمانے سے تیرگی شاہیؔ
وہ مہر و مہ وہ ستارے تلاش کرتا ہوں

زندگی ہے فرض کو منزل پہ پہنچانے کا نام — زندگی ہے فرض پہ ہنس ہنس کے مر جانے کا نام

موت کیا ہے زندگی کی ایک کروٹ ہی تو ہے — زندگی ہے موت سے ہنس ہنس کے ٹکرانے کا نام

شدتِ دردِ جدائی کی بدولت رات بھر — شمع روتی ہی رہی لے لے کے پروانے کا نام

ہوں اگر شامل ترے جوشِ عمل میں گرمیاں — مشکلیں لیتی نہیں پھر بھول کر آنے کا نام

فرض سے غافل نہ ہو شاہیؔ کسی بھی حال میں — زندگی ہے فرض کی خاطر ہی مٹ جانے کا نام

روح بنکر ذرے ذرے میں سماتے جائیے — حسنِ عالم تاب کے جلوے دکھاتے جائیے

پھر حریمِ دل میں آ کر مسکراتے جائیے — پھر مری اجڑی ہوئی دنیا بساتے جائیے

اور بھی بیتاب ہو جس سے مرا بیتاب دل — سازِ دل پر پھر وہی نغمہ سناتے جائیے

پھر وہی مستی نظر میں ہو وہی کیف و سرور — پھر وہی صہبائے جاں پرور پلاتے جائیے

کیا امیدِ زندگی دم کا بھروسہ کچھ نہیں — آپ ہنس ہنس کر مرے دل میں سماتے جائیے

ہر گھڑی ناکامیِ دل کی شکایت ہے فضول — راہِ غم میں ہر قدم پر مسکراتے جائیے

جذبِ دل کا واسطہ عہدِ محبت کی قسم — دور رہ کر بھی مرے نزدیک آتے جائیے

شکوۂ بیداد کیا شاہیؔ جفا کا کیا گلہ
خرمنِ دنیائے نفرت کو جلاتے جائیے

○

جنہیں نسبت ہو تیرے آستاں سے — پھریں وہ دربدر بے خانماں سے ؟
جنہیں ہیں مہرباں سمجھا تھا اپنا — نظر آتے ہیں وہ نامہرباں سے
حقیقت کھل گئی دنیا پہ آخر — نہیں اچھا کوئی ہندوستاں سے
وہ کچھ یوں گفتگو کرتے ہیں شاہی — کہ جیسے تیر چلتے ہوں زباں سے

○

کچھ کم یہ داغہائے محبت نہیں مجھے — فصلِ بہار تیری ضرورت نہیں مجھے
جور و ستم ہیں اور دلِ غم پسند ہے — اب آرزوئے لطف و عنایت نہیں مجھے
بیگانگیٔ دوست کا شکوہ ہے واقعی — بے مہریٔ جہاں کی شکایت نہیں مجھے
بیٹھا ہوں بزمِ ناز میں یوں آج دم بخود — اظہارِ شوق کی بھی اجازت نہیں مجھے
جی چاہتا ہے ان سے کہوں اپنے دل کا حال — لیکن بیانِ حال کی جرأت نہیں مجھے
جنکا ستم بھی عینِ کرم ہے مرے لئے — وہ یہ کہیں کہ اُن سے محبت نہیں مجھے
اے دل خیالِ ترکِ محبت بجا سہی — لیکن مجالِ ترکِ محبت نہیں مجھے

شاہی وہ ہر گھڑی ہیں تصور میں جلوہ ریز
اب اِمتیازِ خلوت و جلوت نہیں مجھے

○

غمِ ہجر میں ہم جیئے جا رہے ہیں
بڑا مرحلہ سر کئے جا رہے ہیں

کئے جاتی ہیں چاک پیہم بہاریں
رفو ہم گریباں کئے جا رہے ہیں

تری انجمن سے چلے جانے والے
بہت داغ دل میں لئے جا رہے ہیں

خدا جانے انجام کیا ضبط کا ہو
شب و روز آنسو پیئے جا رہے ہیں

ترے روئے پُر نور کے تذکروں سے
منوّر جہاں کو کئے جا رہے ہیں

عداوت کی ظلمت میں ہم روز شاہی
پیامِ محبت دیئے جا رہے ہیں

○

فسانہ کہتی ہے دُنیا جو کہتی شام کے بعد
ہمارا نام بھی ہوتا ہے اُن کے نام کے بعد

گِلہ نہ کیجئے کچھ اُن کی بے نیازی کا
کہ ایسا ہوتا ہے محفل میں دورِ جام کے بعد

ہزار بار وہ بگڑے ہیں مجھ سے اُلفت میں
دُعا سے پہلے کسی دن کبھی سلام کے بعد

ہجومِ یاس و غم و درد سے نہ گھبراؤ
نمودِ صبح ہے لازم سوادِ شام کے بعد

اُٹھو اُٹھو کہ تمہیں وقت نے پکارا ہے
سنو سنو کہ سحر ہو رہی ہے شام کے بعد

یہ تیری شعلہ بیانی کا ہے اثر شاہی
وہ یاد کرتے ہیں تجھکو ترے کلام کے بعد

تمہارے آستاں سے اُٹھ کے دیوانے کہاں جاتے
ہے مشعل زندگی جنکی وہ پروانے کہاں جاتے

اگر ہوتا نہ رنگِ دلنوازی انکی محفل میں
تو دل والے فریبِ آرزو کھانے کہاں جاتے

امیدیں دل کی بر آتیں جو دنیائے محبت میں
مری ناکامیِ پیہم کے افسانے کہاں جاتے

اگر اپنے کرم سے وہ چھپا لیتے [illegible]ن میں
تو دنیا بھر کے ٹھکرائے ہوئے جانے کہاں جاتے

درِ پیرِ مغاں سے اُٹھ گئے ہوتے جو مستانے
تو یہ شیشے یہ پیمانے یہ میخانے کہاں جاتے

ازل ہی سے ہمارے بخت میں تھی دشت پیمائی
اماں بستی میں ملجاتی تو ویرانے کہاں جاتے

نہ جل بجھتے جو پروانے وفورِ شوق میں شاہی
تو پھر عشق و محبت کے یہ افسانے کہاں جاتے

جذبۂ خام سے ڈر لگتا ہے
اس کے انجام سے ڈر لگتا ہے

صحبتِ عام سے ڈر لگتا ہے
دورِ بدنام سے ڈر لگتا ہے

مست آنکھوں سے عطا کر ساقی
گردشِ جام سے ڈر لگتا ہے

مل گئی جب سے مجھے دولتِ عشق
درم و دام سے ڈر لگتا ہے

پختۂ عشق نہیں ہوں شاہی
شوقِ ناکام سے ڈر لگتا ہے

لٹا کے دولتِ دنیا تے عاشقی میں نے
جہانِ حسن کو بخشی ہے زندگی میں نے

مری نظر سے ہوا ہے فروغِ رنگِ بہار
چمن میں پھول بنا دی ہے ہر کلی میں نے

جبینِ شوق جھکائی ہے ذرے ذرے پر
قدم قدم پہ ادا کی ہے بندگی میں نے

بڑے ہی فیض رساں ہیں مرے جگر کے داغ
مہ و نجوم کو بخشی ہے روشنی میں نے

ترے کرم کے سہارے امید کی کشتی
تلاطمِ غمِ ہستی میں ڈال دی میں نے

یہ دستِ شوق کی مشاطگی کا ہے اعجاز
کہ زلفِ لیلیٰ عالم سنوار دی میں نے

کلی کلی متبسم ہے آج گلشن میں
روش روش کو عطا کی ہے تازگی میں نے

میں خضرِ قافلۂ زندگی ہوں اے شاہی
دیا ہے دہر کو اندازِ رہبری میں نے

ہر سو کسی کے جلوے نظر در نظر ملے
آنکھیں ہوں معتبر تو دلِ معتبر ملے

جس سے جہانِ حسن کے جلووں کو ہو فروغ
اربابِ آرزو کو وہ ذوقِ نظر ملے

سجدوں کو دے رہا ہوں بہت دن سے میں فریب
اے دوست کاش مجھ کو ترا سنگِ در ملے

لے آئی کس مقام پہ جانے تری تلاش
تیرا پتا ملے تو کچھ اپنی خبر ملے

عکسِ حسنِ جاں فروز کے جلوے ہیں ہر طرف
یہ آرزو ہے چشمِ حقیقت نگر ملے

شاہی جگر کے خون سے سینچا ہے یہ چمن
میری دعا ہے اہلِ چمن کو ثمر ملے

محبت محرمِ رازِ نہاں معلوم ہوتی ہے
کہ ہر سُو دوست کی صورت عیاں معلوم ہوتی ہے

تمہاری ہر ادا تیغِ رواں معلوم ہوتی ہے
خلش زخمِ جگر کی جاوداں معلوم ہوتی ہے

حقیقت کُھل گئی اُن پر دلِ بیتاب کی آخر
ہماری بے زبانی ہی زباں معلوم ہوتی ہے

شکوں دشوار ہے ہنگامہ زارِ زیست میں اے دل
کہ ہر سُو شورشِ دورِ جہاں معلوم ہوتی ہے

گنہگارِ محبت ہوں چُھپا لو اپنے دامن میں
مجھے اب زندگی بارِ گراں معلوم ہوتی ہے

نشیمن کو جلا کر بھی نہیں ہے برق آسودہ
مری خاکِ نشیمن [illegible] معلوم ہوتی ہے

زبانِ اشک سے شاہی جسے کہتے ہو رک رک کے
یہ دل کی داستانِ خونچکاں معلوم ہوتی ہے

قیامت تھا برقِ نظر کا اشارا
کہ سینہ میں دل ہو گیا پارا پارا

خُدا کے لئے اپنی نظریں سنبھالو
کہیں ہو نہ جائے جگر پارا پارا

یہ اُٹھتی جوانی یہ حُسنِ تبسم
قیامت ہے دل کیلئے ہر نظارا

یہ بپھری ہوئی موجِ بادِ حوادث
مٹا کیا سکے گی نشیمن ہمارا

گلہ دشمنوں سے نہیں مجھکو شاہی
مجھے دوستوں کی عنایت نے مارا

○

بھلا وہ شرح و بیاں میں بھی لائی جاتی ہے
جو بات آنکھ کے اِشاروں میں پائی جاتی ہے

نقابِ چہرۂ زیبا اُٹھائی جاتی ہے
نظر نوازِ تجلّی دِکھائی جاتی ہے

بہارِ حسن کی افسوں طراز رنگینی
شعور و ہوش کی دُنیا پہ چھائی جاتی ہے

تُمہارے حسنِ دل افروز کی شعاعوں سے
تمام بزمِ جہاں جگمگائی جاتی ہے

قدم قدم پہ ستم اہلِ دِل پہ ہوتے ہیں
قدم قدم پہ وفا آزمائی جاتی ہے

جبینِ حسن کی ہر ضو فشاں کرن شاہی
ہمارے دیدہ و دِل میں سمائی جاتی ہے

○

رنگین بہاروں کا ہے جلوہ کوئی دِن کا
یہ رنگِ چمن زار ہے گویا کوئی دِن کا

پل بھر میں بکھر جائیگا شیرازۂ ہستی
ہے روح کا اس جسم سے رِشتہ کوئی دِن کا

اے وادیٔ پر کیف کے بھٹکے ہوئے راہی
گھبرا نہ کہ منزل کا ہے رستہ کوئی دِن کا

مانا کہ ہر اک سمت ہیں پر کیف نظارے
لیکن ہے نظاروں کا زمانہ کوئی دِن کا

آجاؤ کہ اب جینے کی اُمّید نہیں ہے
مہمان ہے بیمار تمہارا کوئی دِن کا

○

جب تمنّا جواں نہیں ہوتی — زندگی شادماں نہیں ہوتی
غم کے ماروں کا حال کیا کہیئے — اُنکی حالت بیاں نہیں ہوتی
تیرا غم راس آگیا جنکو — اُنکے لب پر فُغاں نہیں ہوتی
جس نے ٹھکرا دیا ہو دنیا کو — اس کی دُنیا کہاں نہیں ہوتی
عشق صادق ہو چکا اے شاہیؔ — اُنکے منہ میں زباں نہیں ہوتی

○

نہ سوچا کبھی دل لگانے سے پہلے — کہ مٹ جائیں گے دِل کے جانے سے پہلے
مرے دل کی دنیا تھی ویران کتنی — اَلَم اُن کا دل میں بسانے سے پہلے
کہاں تھی ترے حُسن میں یہ تجلّی — ہماری نظر میں سمانے سے پہلے
خلافِ وطن کر رہے ہیں جو سازش — کُچل دو انہیں سَر اُٹھانے سے پہلے

بیاں کیا کریں ایسے غنچوں کا شاہیؔ
جو مُرجھا گئے مُسکرانے سے پہلے

آنکھوں میں رنگ و نور کی دنیا بسی رہی
پھر بھی نگاہِ شوق میں اک تشنگی رہی

راہِ وفا میں آپ کا غم بھی رہا ہے دوست
ہر چند ساتھ ساتھ مرے سرخوشی رہی

جلوؤں کی روشنی میں سکونِ نظر کے ساتھ
رگ رگ میں روح بن کے خوشی دوڑتی رہی

اے دوست رنگِ حسنِ گلستاں تو خوب ہے
ہم بھی کریں گے سیر اگر زندگی رہی

مرنے کے بعد ہوتی ہے فکرِ نشاں فضول
شاہی جہاں میں کس کی ہمیشہ بنی رہی

جب عشق کی جرأت نے رخ کر کے اُدھر دیکھا
دنیائے محبت کو ہوتے ہوئے سر دیکھا

قدرت کے نظاروں کو ہر شام و سحر دیکھا
تم نے بھی اِدھر دیکھا ہم نے بھی اُدھر دیکھا

ہو جاتے ہیں خوش اُن سے تقدیر کے مارے بھی
پُرکیف نظاروں کا ہر دل پہ اثر دیکھا

اُس حسنِ مجسّم کے جلوؤں کی کشش توبہ
مڑ مڑ کے جنھیں ہم نے تا حدِّ نظر دیکھا

برباد محبت کی بے تاب نگاہوں نے
رہ رہ کے لہو رویا پھولوں کو اگر دیکھا

سنتے ہی دل و جاں پر اک کیف ہوا طاری
شاہی ترے شعروں میں جادو کا اثر دیکھا

قِطعات

مال و دولت کا نہ شہرت کا طلبگار ہوں میں
اے وطن تیری محبت میں گرفتار ہوں میں
آفتوں میں بھی رہے گی مری ثابت قدمی
ٹوٹ جاؤں گا نہ لچکوں گا وہ خود دار ہوں میں

○

آج غیرت کو کس نے للکارا — ہم سے کس کو ہے حوصلہ ستیز
عرصۂ جنگ میں خدا کی قسم — موت سے بھی نہ ہم کرینگے گریز

○

نوجوانو! صدائے وقت سنو — عالمِ یاس میں نہ سر کو دھنو
دل میں عزمِ بلند لے کے اٹھو — گلِ امید آگے بڑھ کے چنو

○

دے رہے ہیں جو جنگ کی دعوت — بجلیاں بن کے اُن پہ لہراؤ
کاٹ دو بڑھ کے اُن کے قلب و جگر — نوجوانو! ذرا نہ گھبراؤ

ہم ہیں رشیوں کی پاکباز اولاد
ہم ہیں بھارت کے بازوئے فولاد

ظالمو! کان کھول کر سُن لو
ہم ہلادیں گے جور کی بُنیاد

○

یہ جواہر کا دیش ہے اسمیں
بھیم دارجن سے شیر رہتے ہیں

ٹکریں لینے والے طوفاں سے
کب کسی کا غرور سہتے ھیں

○

زندگی پُروقار ہو نہ اگر
ایسے جینے سے موت ہے بہتر

اپنی غیرت اگر ہو خطرے میں
جنگ ہوتی ہے فرض انساں پر

○

آدمی کے لہو سے لکھے گا
وقت کچھ اس طرح کا افسانا

زندگی اپنے آپ چاہے گی
موت کے ساتھ ہنس کے ٹکرانا

یہ زبان و بیاں یہ فکر و نظر — صورتیں حسنِ شعر کی ہیں نئی
نئے ماحول کے اُجالے میں — ایک تصویر کے ہیں عکس کئی

○

ہم نے ہر گام اپنے دشمن پر — عرصۂ جنگ میں ظفر پائی
صلح کی میز پر خدا جانے — ہم نے دشمن سے ماتیں کیوں کھائی

○

دال سازش کی گل گئی ہوتی — چال دشمن کی چل گئی ہوتی
ہم بجھاتے نہ خونِ دل سے اگر — امن کی شاخ جل گئی ہوتی

○

سخت محنت کے بعد بھی انساں — خشک روٹی کو رات دن ترسے
خوب تقسیم ہے مرے رزّاق — کچھ ہوں محروم کچھ پہ ہُن برسے

جسکو قانون آپ کہتے ہیں وہ تو مکڑی کا ایک جالا ہے
جو تھا کمزور بس پھنس گیا اسمیں زور آور نے توڑ ڈالا ہے

○

یہ جواں سال حسن کے پیکر جنکی عظمت وطن کی عظمت ہے
کتنا افسوس ہے کہ اُن کا لباس نامِ عصمت پہ ایک لعنت ہے

○

جتنے اُردو کے نام لیوا ہیں کاش وہ سب قدم ملا کے چلیں
حسنِ عزم و عمل کی قوت سے اُلفتوں کے دیئے جلا کے چلیں

○

وقت اب ایسا آنے والا ہے زندگی جب سکون پائے گی
پھول ناچیں گے صحنِ گلشن میں اور عروسِ بہار گائے گی

زیبِ تن جو لباس ہے اُس میں — سارے اعضا بدن کے ہیں عریاں
ایسے عالم کو دیکھ کر شاہی — پانی پانی ہے غیرتِ انساں

○

لمبے چوڑے بیان دینے سے — زندگی تو سکوں نہیں پاتی
کام چلتا نہیں فریبوں سے — مفلسی اس طرح نہیں جاتی

○

لفظ باقی ہیں اور معنی گُم — بُجھ گیا شعلہ دُود باقی ہے
رُوحِ انسانیت ہوئی غائب — صرف خاکی وجود باقی ہے

○

ایسی دُنیا کو کیا کرے کوئی — خُون روتی ہو زندگی جس میں
رقص کرتی ہوں ظلمتیں ہر سُو — نام کو ہو نہ روشنی جس میں

روشنی کے نئے خداؤں کو　　　سیم و زر سے بڑی محبت ہے
درد مندوں سے بے نواؤں سے　　　سخت نفرت تھی، سخت نفرت ہے

○

جو مساوات کے ترانوں کو　　　روز اسٹیج پر سناتے ہیں
کتنے شاطر ہیں کیا کہا جائے　　　آئے دن جو ہمیں بناتے ہیں

○

جھوٹ کے نام کو ہے آنچ کہاں　　　جھوٹ کا آج بول بالا ہے!
سچ سرِ عام پٹ رہا ہے مگر　　　رہنماؤں کے منہ پہ تالا ہے

○

لطف آنے لگا ہے دنیا کو　　　جھوٹے وعدوں میں جھوٹی قسموں میں
ایسے ماحول سے بچائے خدا　　　کھوکھلا پن ہے جن کی رسموں میں

نام پر ملک و قوم کے اکثر — سینکڑوں روزگار چلتے ہیں
دیش سیوا کی آڑ میں کتنے — دشمنِ ملک و قوم پلتے ہیں

○

اِنتخابات ہونے والے ہیں — ووٹ ہم کو ہی ڈالیئے صاحب
ہم ہیں دیرینہ آپ کے خادم — در سے خالی نہ ٹالیئے صاحب

○

گورو نانک دیو جی مہاراج

منبعِ نور اے گورو نانک — تیری بانی پوترِ بانی ہے
اور چیزوں کو ہے فنا لیکن — تیری تعلیم غیر فانی ہے

●

نورِ انسانیت گورو نانک — تجھ سے روشن ہیں چرخ پر تارے
حسنِ عزم و عمل کی قوت سے — تو نے بدلے ہیں وقت کے دھارے

●

درسِ مہر و وفا دیا سب کو — تو نے راہِ عمل دکھائی ہے
اہلِ عالم نے تیری راہوں میں — پُرمسرت حیات پائی ہے

وطن کے عظیم سپاہی شری لال بہادر شاستری کی وفات پر

رنگِ حسنِ چمن کا دیوانہ — بادۂ حریت کا مستانہ
ناگہاں آج ہو گیا خاموش — شمعِ عزم و عمل کا پروانہ

●

نصیبِ اہلِ چمن کا درخشاں تارا تھا
جو بیکسانِ وطن کا بڑا سہارا تھا
وہ تاشقند کی وادی میں گم ہوا افسوس
ہمارا لال بہادر جو سب کو پیارا تھا

●

بجھائی آگ عداوت کی دیکر اپنی جاں — جو کام کرنا تھا وہ کام کر گیا اپنا
عذابِ جنگ سے قوم و وطن کئے آزاد — بساطِ دہر پہ وہ نام کر گیا اپنا

۱۲ر جنوری ۱۹۶۶ء

رہبرِ اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کی رحلت پر

رہبرِ قوم وہ جواہر لعل — موت کے دیو کا شکار ہوا
یہ خبر سُن کے رُوح کانپ اُٹھی — دامنِ ہوش تار تار ہوا

•

رازدارِ حیات ہے خاموش
محرمِ کائنات ہے خاموش
صفِ ماتم بچھی ہے عالم میں
نہروئے با صفات ہے خاموش

•

جس نے آزادیِ وطن کیلئے — اپنے قلب و جگر کا خون دیا
وہی جانباز و شیر دل نہرو — ہم سے دستِ قضا نے چھین لیا

شہیدانِ وطن

سرتاجِ شہیدانِ بھارت
سُکھ دیو، بھگت سنگھ، راجگورو
مرکز تھے وطن کی عزّت کا
خائف تھے نام سے جن کے عدو

•

شمعِ آزادیٔ وطن پہ ہوتے
کس خوشی سے فِدا یہ پروانے
دار پر ہنستے ہنستے جُھول گئے
بادۂ حُرّیت کے مستانے

"ہریانہ"

جسکا پانی ہے رُوکشِ کوثر — وہ زمیں ہے زمینِ ہریانہ
مانے جاتے ہیں ساری دُنیا میں — مردِ میداں مکینِ ہریانہ

●

ہرشِ دردھن کی آرزوؤں کا
آئینہ ہے بہارِ ہریانہ
ربِّ کون و مکاں کے فیض سے ہے
رشکِ جنّت دیارِ ہریانہ

●

پیکرِ عزم و استقامت ہیں — طفل و پیر و جوانِ ہریانہ
رُوح پرور ہے اِسکی شادابی — روز افزوں ہے شانِ ہریانہ

"جے جوان"

آفریں اے جوانِ ہریانہ　　دھاک تیری ہے کارزاروں میں
جنگ جُو یودھے[1] گن کا خون ہے تُو　　نام ہے تیرا تیغ داروں میں

•

"جے کسان"

منظر افروز یہ بہاریں ہیں
عکس تیرا ہے اِن بہاروں میں
جہدِ پیہم سے تُو نے بدلا ہے
ریگ زاروں کو لالہ زاروں میں

•

---

[1] سکندرِ اعظم کے حملے کے زمانے میں "یودھیہ گن" کی جمہوری حکومت تھی۔ اسی "گن" کے بہادروں نے سکندر کو ستلج سے آگے بڑھنے سے روکا تھا۔　　شاھی

جن بہاروں نے ہم کو لوٹ لیا　　اُن بہاروں کی بات کیوں چھیڑو
ہم تو صحرا نورد ہیں شاہی　　لالہ زاروں کی بات کیوں چھیڑو

جو کسی کے کبھی ہو سکے نہ رفیق　　ایسے یاروں کی بات کیوں چھیڑو
فتنہ و شر کے ہم نہیں قائل　　فتنہ کاروں کی بات کیوں چھیڑو

شمعِ اُلفت کو فروزاں کر دے　　ذرّے ذرّے کو درخشاں کر دے
لے کے اخلاص و وفا کی مشعل　　ظلمتِ شب میں چراغاں کر دے

دین و دُنیا کا واسطہ دے کر　　نیک بندوں کی اوٹ لیتے ہیں
اپنے مطلب کے آشنا ہیں یہ　　آج ہم سے جو ووٹ لیتے ہیں

تیاگ کی اور پریم کی تصویر بن　　بے نیازِ گردشِ تقدیر بن
اس جہانِ حُسن کا شیدا نہ ہو　　آپ اپنے حُسن کی تنویر بن

●

مسکراتا ہوا سرمستِ شباب آتا ہے
آج اُلٹے ہوئے رُخ سے وہ نقاب آتا ہے
ہوگئیں بارگہہِ حسن میں شاید مقبول
میری معصوم دُعاؤں کا جواب آتا ہے

●

تیرے دَم سے زندگی میں تھی بہار آئی ہوئی
آہ لیکن اب نہیں مِلتا بہاروں کا نِشاں
اے بہارِ زندگی اے میری دُنیائے حیات
آ کہ نظروں میں مِری تاریک ہے سارا جہاں

●

ہاں نہیں حاصل مجھے جاہ و حشم مال و منال
اِسکا کوئی غم نہیں اِس کا نہیں کوئی ملال
اے مِری جانِ تمنّا اِک یہی ہے آرزو
ذِکر ہو تیرا زباں پر دِل میں ہو تیرا خیال

●

بدلے ہوئے حالات نے دِل توڑ دیا
اِس دَور کی ہر بات نے دِل توڑ دیا
غیروں کے مظالم کا تو کیا ذِکر اے دوست
اپنوں کی عنایات نے دِل توڑ دیا

●

بھاشاؤں کی تکرار تو لے ڈوبے گی
بیکار کی پیکار تو لے ڈوبے گی
اے دوست اگر لینگے نہ ہم ہوش سے کام
حالات کی رفتار تو لے ڈوبے گی

●

•

عرصۂ جنگ میں نہ ڈر ناداں
مورچہ ہے یہ بے خطر ناداں
موت تو بابِ عیشِ جنت ہے
موت سے کس لئے حذر ناداں

•

حسن کو بار بار دیکھیں گے
شوق کو کامگار دیکھیں گے
ہر کسی کو بھلا نصیب کہاں
آنکھ والے بہار دیکھیں گے

•

ساز و سامانِ رنگ و بو کر لوں
خود کو گلشن میں سرخرو کر لوں
اے نسیمِ سحر اجازت دے
جا کے غنچوں سے گفتگو کر لوں

•

قصرِ امید کی شمعوں کو فروزاں کر دے
جادۂ شوق کے ہر ذرّہ کو تاباں کر دے
ہاتھ میں مشعلِ اخلاص و محبت لیکر
ظلمتِ دہر میں ہر سمت چراغاں کر دے

•

وقتِ بد میں سبھی غمخوار بدل جاتے ہیں
ابنِ آدم کے سب اقرار بدل جاتے ہیں
جب برے آتے ہیں ایام کسی کے شاہی
ہمدم و یار و مددگار بدل جاتے ہیں

یہ بج رہے ہیں یُونہی کان ورنہ اے شاہیؔ
نہ آ رہا ہے کوئی اور نہ جا رہا ہے کوئی

نظمیں

وَحدتِ اِنسانیت

اَصلِ آدم ایک ہے اور نسلِ آدم ایک ہے
سارا عالم ایک ہے یہ سارا عالم ایک ہے

خاک امریکہ کی ہو بھارت کی ہو یا چین کی
اِس کے ذرّوں میں نہ پاؤ گے کہیں بیشی کمی
مشرق و مغرب میں ہے پانی کی صورت ایک ہی
ہر جگہ ہے اِس کی فطرت اور خصلت ایک ہی
ساری دُنیا کو ہوا ہی بخشتی ہے رنگ رُوپ
ہر طرف ہمشکل ہیں یہ آگ اَمبر چھاؤں دُھوپ
ہو گئے عَنصر بہم سب چھوڑ کر اضداد کو
بخش دی کتنی حسیں پوشاک آدم زاد کو
کر دیا فِطرت کی فیّاضی نے پیدا یہ جہاں
فیض اس کی نعمتوں سے پاتے ہیں خُورد و کلاں
خشک و تر زیر و زبر پر اسکا لُطفِ عام ہے

اشرف المخلوق ہے تو پیدا کر کوئی کمال
سچا بیٹا بن کے فطرت کی وراثت کو سنبھال
کہیئے انساں اُسکو، ہے انسانیت جسکو عزیز
دُور کر دے لال پیلے گورے کالے کی تمیز
بولیوں، مُلکوں کے، تہذیب و زباں کے تفرقے
کھیلتے ہیں ہولیاں کیوں آدمی کے خُون سے

ایک ہے فرزندِ فطرت، ابنِ آدم ایک ہے
سارا عالم ایک ہے یہ سارا عالم ایک ہے

•

"مرے دیش کا شیر بانکا سپاہی"

مرے دیش کا شیر بانکا سپاہی — رہِ امنِ عالم کا بے خوف راہی
عدو کی صفوں میں مچانے تباہی — چلا جا رہا ہے بڑھا جا رہا ہے

ستمگر کو بزمِ جہاں سے اٹھانے — شجاعت کے جرأت کے جوہر دکھانے
بصد شوق دشمن کے تیر آزمانے — چلا جا رہا ہے بڑھا جا رہا ہے

وہ نفرت کی ظلمت کا ہر قصر ڈھاتا — چراغِ محبت دلوں میں جلاتا
وہ سازِ عمل پر ترانے سناتا — چلا جا رہا ہے بڑھا جا رہا ہے

وہ میداں میں بھگدڑ مچا دینے والا — وہ دشمن کے چھکے چھڑا دینے والا
وہ پیٹن کے پرزے اڑا دینے والا — چلا جا رہا ہے بڑھا جا رہا ہے

زمانے میں چرچا ہے جسکے چلن کا — وہ پاکیزہ بیٹا ہے گنگ و جمن کا
وہ سر باز و جانباز میرے وطن کا — چلا جا رہا ہے بڑھا جا رہا ہے

مرے دیش کا شیر بانکا سپاہی

مادرِ ہندوستاں

مادرِ ہندوستاں اے مادرِ ہندوستاں / ساری دنیا کیلئے ہے تو چراغِ ضو فشاں

تیرے قدموں پر بچھا ہر دولتِ کون و مکاں / مادرِ ہندوستاں اے مادرِ ہندوستاں

کس قدر شاداب ہیں تیری امیدوں کے چمن / تیرے دامن پر ہیں رقصاں ستلج و گنگ و جمن

اوجِ گردوں پر نمایاں تیری عظمت کے نشاں / مادرِ ہندوستاں اے مادرِ ہندوستاں

ہندو مسلم سکھ عیسائی ہیں ترے لختِ جگر / پارسی جینی یہودی بودھ بھی تیرے پسر

سر جھکاتے ہیں تیری تعظیم کو پیر و جواں / مادرِ ہندوستاں اے مادرِ ہندوستاں

رشی گوتم پتنجلی کے جگر پارے ہیں سب / شیر دلِ گوبند سنگھ کی آنکھ کے تارے ہیں سب

عظمتِ انسانیت کی انکے دم سے عز و شاں / مادرِ ہندوستاں اے مادرِ ہندوستاں

ڈالدے ٹیڑھی نظر تجھ پر یہ ہے کس کی مجال / ہم جھپٹ کر کھینچ ڈالیں گے ترے دشمن کی کھال

ہم گریں گے دشمنوں کے سر پہ بن کر بجلیاں / مادرِ ہندوستاں اے مادرِ ہندوستاں

سر بکف جانباز سب میداں میں لڑتے ہیں یہ / بے خطر ہر مورچے پر ٹوٹ کر پڑتے ہیں یہ

دشمنوں کی جان کی خاطر ہیں یہ مرگِ بے اماں / مادرِ ہندوستاں اے مادرِ ہندوستاں

تیری تعظیم و محبت کی قسم کھاتے ہیں ہم / سچے دل سے تیری عظمت کی قسم کھاتے ہیں ہم

ظلم رانوں کا مٹائیں گے ہمیں نام و نشاں / مادرِ ہندوستاں اے مادرِ ہندوستاں

میں بھول جاؤں تمہیں میرے بس کی بات نہیں

وہ صبح و شام کی رنگینیاں وہ رات نہیں
سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی حیات نہیں
نہیں ہے پہلا سا وہ رنگِ کائنات نہیں
میں بھول جاؤں تمہیں میرے بس کی بات نہیں

وہ لطفِ خاص نہیں حسنِ التفات نہیں
مری حیات میں وہ گرمیٔ حیات نہیں
تمہارے دم سے تھی جو دل کی کائنات نہیں
میں بھول جاؤں تمہیں میرے بس کی بات نہیں

بساطِ دہر پہ جب دونوں وقت ملتے ہیں
تمہارے حسنِ تبسم کے پھول کھلتے ہیں
دل و جگر کے سبھی چاک خود ہی سلتے ہیں
میں بھول جاؤں تمہیں میرے بس کی بات نہیں

●

سلام

لٹایا وطن کے لئے مال و زر
کٹایا وطن کے لئے اپنا سر
وطن کے لئے صبح دیکھی نہ شام
سلام اے وطن کے شہید و سلام

حوادث نے کر دینا چاہا تھا غرق
مگر پائے ہمت میں آیا نہ فرق
کئے نوش ہنس کر شہادت کے جام
سلام اے وطن کے شہید و سلام

مئے حبِ قومی کو پیتے رہے
اسی شان و شوکت سے جیتے رہے
جہاں میں امر کر گئے اپنا نام
سلام اے وطن کے شہید و سلام

حمد

بنائے دہر ہو تم سازِ ہستی کی صدا تم ہو — جہانِ رنگ و بو کی ابتدا و انتہا تم ہو
غریبوں بے کسوں کے کارساز و منوا تم ہو — جسے مشکل کشا کہتے ہیں وہ مشکل کشا تم ہو
منور کل جہاں جس سے ہے وہ نورِ ہدیٰ تم ہو — سراپا حسنِ فطرت ہو ستاروں کی ضیاء تم ہو

جہانِ عشق میں دردِ محبت کی دوا تم ہو!
مسیحائے زماں تم ہو سر بسر دستِ شفا تم ہو

پنڈت جواہر لعل نہرو کے جنم دن کی خوشی میں

اے جواہر لعل تو ہے آفتابِ حریت — سرزمینِ ہند کے ذروں میں تجھ سے نور ہے
قوم کو بخشی ہے تو نے زندگی کی روشنی — آدمیت کی ضیا سے تیرا دل معمور ہے

•

رہنمائے ہند فخرِ ایشیا فخرِ جہاں — محرمِ اسرارِ عالم اے امیرِ کارواں
اے دلِ و جانِ وطن نورِ چراغِ زندگی — تیرے دم سے اوج پر ہے پرچمِ ہندوستاں

•

ترانہ

ہندوستاں ہمارا

لہرا کے کہہ رہا ہے قومی نشاں ہمارا
مرکز ہے حرّیت کا ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے افضل سارے جہاں سے برتر
سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

چشمے اُبل رہے ہیں علم و ہنر کے ہر سُو
سرسبز جنکے دم سے ہے گُلستاں ہمارا

جانباز، دشمنوں کی دھمکی سے کیا ڈریں گے
ہمّت جو ہو تو کرلیں وہ اِمتحاں ہمارا

اِس بات سے یقیناً واقف نہیں ہیں دشمن
جانباز و سر بکف ہے ہر نوجواں ہمارا

حیرت سے تک رہے ہیں دُنیا کے لوگ شاہی
ہر آن بڑھ رہا ہے اب کارواں ہمارا

دیارِ ہند میں وہ بھی زمانے آئے تھے

کنہیا گیت محبت کے گانے آئے تھے
عداوتوں کو جہاں سے مٹانے آئے تھے

تھے دوستدار غریبوں کے بے نواؤں کے
ستمگروں کو جہاں سے مٹانے آئے تھے

ضیائے حق سے اندھیرے مٹا کے دنیا کے
نئے چراغ جہاں میں جلانے آئے تھے

جو کائنات کو مبہوت کر گئے یکسر
وہ بانسری سے ترانے سنانے آئے تھے

جلا کے خاک جو کردے گناہِ انساں کو
وہ پاک آگ دلوں میں جلانے آئے تھے

نگاہیں حسنِ ازل کے لئے ترستی تھیں
نظر سے پردہ غفلت اٹھانے آئے تھے

ہر اک نگاہ تصدق ہے ایک دل قرباں
تماشہ حسنِ ازل کا دکھانے آئے تھے

تو سجدہ رہ گیا اب سنگِ آستاں ہو کر
فقط نیاز سے ہم سر جھکانے آئے تھے

نہار ہے تھے بھی رنگ و نور میں شاہی
دیارِ ہند میں وہ بھی زمانے آئے تھے

●

بھارت ماتا

اے مہا شکتی اے مہا مایا
نام سے تیرے کانپتے ہیں عدو

شعلۂ عزم کی حرارت سے
خشک ہوتا ہے دشمنوں کا لہو

اے خوشا تیرا پیکرِ اقدس
تو ہے سارے جہاں کی روحِ رواں

پڑ گیا جو تری جبیں پہ شکن
دشمنوں کو ہے موت کا ساماں

تیرے بیٹوں کی ضربِ کاری سے
چھا گیا ظالموں پہ خوف و ہراس

آتشِ حق کی آنچ سہہ نہ سکے
جل گئے دشمنوں کے ہوش و حواس

تیرا پیغامِ عام امن و اماں
تیرے قدموں میں فتح و نصرت ہے

دردِ انساں ہے تیرے سانسوں میں
تیرے اقوال میں صداقت ہے

دیوتاؤں کو دیت مار نہ دیں
تو نے ان سب کی جاں بچائی ہے
ہاں اٹھائے رکھ اپنا بایاں ہاتھ
آج درگا ہے تو بھوانی ہے

انقلابِ تازہ

کیا آرہی ہے بامِ فلک سے ندا سنو
تسکین ملنے والی ہے روحِ حیات کو
اٹھو جوانو! جادۂ تعمیر پر بڑھو
اک انقلابِ تازہ کے آثار ہیں عیاں

تنظیمِ ملک و قوم کا جذبہ لئے ہوئے
مظلوم و بے نوا کو سہارا دیئے ہوئے
شمعِ عمل دلوں میں فروزاں کئے ہوئے
اِک انقلابِ تازہ کے آثار ہیں عیاں

ہر ہر قدم اندھیروں کے کس بل نکال کر
ہر شے کو رنگ و نور کے سانچے میں ڈھال کر
بڑھتا ہی آرہا ہے بلاؤں کو ٹال کر
اِک انقلابِ تازہ کے آثار ہیں عیاں

محروم جو ہیں دولتِ صبر و قرار سے
گھبرائیں اب نہ گردشِ لیل و نہار سے
ملنے کو ہے نجات غمِ روزگار سے
اِک انقلابِ تازہ کے آثار ہیں عیاں

کس کی مجال ہے کہ ہلائے زبان و لب
پر نوچ کر رہے گا یہ مرغِ ہوس کے اب
ہوگا حیاتِ نو کا وطن کے لئے سبب
اِک انقلابِ تازہ کے آثار ہیں عیاں

●

تاج محل

آج شاہِ جہاں نہیں لیکن　　نور افشاں ہے اُسکے دِل کا کنول
قصرِ فردوس کا ہے عکسِ جمیل　　لوگ کہتے ہیں جس کو تاج محل
حُسنِ بے مثل کا نمونہ ہے　　اِس کا شفّاف و مرمریں آنچل
لبِ جمنا پیامِ مہر و وفا　　دے رہا ہے جہاں کو تاج محل
سنگِ مرمر کی خواب گیں تصویر　　ساری دنیا میں جسکی شہرت ہے
اہلِ دِل کے لئے حقیقت میں　　تاج اِک پیکرِ محبّت ہے
ہر قدم پر جلائے ہیں برسوں　　چشمِ پُرنم سے آنسوؤں کے دیئے
رہ روِ منزلِ محبّت نے　　روحِ مُمتاز کی خوشی کے لئے

اَے محبت کی یادگارِ حسیں
تجھ پہ نازاں ہیں آسمان و زمیں
تیرے جلوؤں سے رُوشنی پاکر
ذرّے بھی بن گئے ہیں مہرِ مبیں

●

میرے پیارے وطن

تیرے دامن میں بہتی ہوئی ندیاں   کوہساروں کی دلکش حسیں چوٹیاں
ہر طرف لہلہاتی ہوئی کھیتیاں   حسنِ فطرت کا مرکز تری انجمن
میرے پیارے وطن میرے پیارے وطن

کیف بر دوش ہیں تیرے منظر سبھی   ہر نظر پر ہے چھائی ہوئی بے خودی
مست و سرشار ہے آرزو کی کلی   گل فشاں ہیں بہاریں چمن در چمن
میرے پیارے وطن میرے پیارے وطن

صبحِ کاشی کے جلووں کی رعنائیاں   شامِ حسنِ اودھ کی وہ زیبائیاں
ارضِ کشمیر کی حسن آرائیاں   روح پرور ہے کتنا ترا بانکپن
میرے پیارے وطن میرے پیارے وطن

پیار کے گیت میرا نے گائے جہاں   بابا نانک نے نغمے سنائے جہاں
لے کے شمشیر گوبند آئے جہاں   اور چشتی نے وحدت کے گائے بھجن
میرے پیارے وطن میرے پیارے وطن

اب کبھی ظالموں نے جو حملے کئے   ہم بجھا دیں گے انکی بقا کے دیئے
دل میں رنگینیٔ عہد و پیماں لئے   تجھ پہ قرباں کریں گے دلِ جان و تن
میرے پیارے وطن میرے پیارے وطن

فصلِ بہار

یہ ہوائے عطر افشاں یہ فضائے خوشگوار — جلوہ گر ہے چار سُو رعنائیِ فصلِ بہار
شاہدِ گُل پوش کی تصویر ہے ساری زمیں — دِلکشا ہر ایک منظر ہر سماں حُسن آفریں
نغمہ پیرا ہیں چمن میں طائرانِ خوش نوا — دامنِ دل کھینچتی ہے حُسنِ فطرت کی ادا
عالمِ احساس پر چھائی ہوئی ہے بےخودی — آج ہر شے سے جھلکتی ہے نشاطِ زندگی
ہے انہیں جلوؤں سے اے شاہی فروغِ انجمن — آرزو ہے تا ابد قائم رہے حُسنِ چمن

•

شیرِ پنجاب لالہ لاجپت رائے

لاجپت رائے رہبرِ بے باک — صاحبِ دل تھا مردِ میداں تھا
اُس کے دم سے تھی آبروئے وطن — سارا پنجاب اُس پہ نازاں تھا
لاجپت رائے کی شہادت نے — جوشِ حُبِّ وطن اُبھار دیا
منزلِ حرّیت کے شیدا نے — اپنی جاں کو وطن پہ وار دیا
لاجپت رائے نے کئے پیدا — جاں نثارانِ راہِ آزادی
اُن کی قُربانیوں سے روشن ہے — آج یہ جلوہ گاہِ آزادی
لاجپت رائے کا ہے نام امر — اُسکی عظمت وطن کی عظمت ہے
آج بھی دیش کے لئے شاہی — لاجپت مشعلِ ہدایت ہے

لفظوں کی قیمت

ہر ایک لفظ ہے در اصل زندگی کا ساز
ہر ایک لفظ سراسر ہے شعلۂ آواز

ہر ایک لفظ میں حسنِ بیاں کی ہے تنویر
ہر ایک لفظ ہے شاہیؔ حیات کی تصویر

اگر زباں سے غلط شکل میں نکل جائے
تو کوئی خیر ہو شر سے وہیں بدل جائے

تم اس لئے اِسے میزانِ عقل میں تولو
کسی نے خوب کہا ہے کہ سوچ کر بولو

ــــــــ کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت

رازدارِ غمِ حیات ندیم
محرمِ حسنِ کوثر و تسنیم

تیری ہر بات میں ہے رنگِ جدید
تیری ہر بات میں ہے حسنِ قدیم

تیری خوشبو سے دل معطر ہیں
تیرا اِک اِک نفس ہے موجِ شمیم

ظلمتِ شب مٹی زمانے سے
ضو فشاں جب ہوئی تری تعلیم

سب کا مخلص ہے خدمتی سب کا
تو سراسر ہے بندۂ تسلیم

تیرا اخلاق ہے بہت اونچا
تیری ہستی ہے قابلِ تعظیم

آپ کی خاکِ پا ہوں میں شاہیؔ
کیجئے ہدیہ ادب تسلیم

اے وطن میرے وطن

مرحبا۔ اے خاکِ پاک، اے خطۂ گنگ و جمن
تیرا ہر ذرّہ ہے تاباں، تیرا ہر ذرّہ چمن
تیرے رنگا رنگ ہیں ہم رنگیوں کا بانکپن
اے وطن میرے وطن پیارے وطن

تو نے بخشی ہے جہاں کو علم و فن کی روشنی
تیرے دم سے ہر قدم پر مٹ رہی ہے تیرگی
ہے تری تہذیب کی ضو ہر طرف جلوہ فگن
اے وطن میرے وطن پیارے وطن

گوکل و متھرا کی خاکِ پاک ہے رشکِ جناں
جس پہ یوگی راج کے نقشِ قدم ہیں ضو فشاں
ہے تنجل بیاس و تلسی کی یہی تو انجمن
اے وطن میرے وطن پیارے وطن

بھیم و ارجن سے بہادر سُورماؤں کی قسم
سُور ویروں رشیوں منیوں دیوتاؤں کی قسم
ہم نہ چھوڑیں گے کبھی دستورِ ماضی کا چلن
اے وطن میرے وطن پیارے وطن

یہ وہ دھرتی ہے جہاں گوتم کپل پیدا ہوئے
ہاں اسی دھرتی پہ لاکھوں اہلِ دل پیدا ہوئے
اس کے شاہد ہیں ہمالا راوی و گنگ و جمن
اے وطن میرے وطن پیارے وطن

اے گورو گوبند و نانک کی بہاروں کے چمن
تیرے فرزندوں میں ہے عزم و عمل کا بانکپن
اُلفتِ انسانیت سے ہے منوّر تیرا من
اے وطن میرے وطن پیارے وطن

لاجپت رائے بھگت سنگھ دت کا خونِ جگر
تیرے ہر ذرّے کی رگ رگ میں رواں ہے سر بسر
جذبۂ حُبِّ وطن ہے سب کے دل میں جوش زن
اے وطن میرے وطن پیارے وطن

لوہا لینے کے لئے میداں میں جب آتا ہے تو
اچھے اچھوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا ہے تو
فخر کرتے ہیں شجاعت پر تری سب مرد و زن
اے وطن میرے وطن پیارے وطن

جنگ بازوں نے کبھی جو بھول کر دیکھا ادھر
آگے بڑھ کر ہم اڑا دینگے وہیں ایک اک کا سر
آج ہم نکلے ہیں شاہی باندھ کر سر پہ کفن
اے وطن میرے وطن پیارے وطن

تم ہو بھارت کی جاگتی تقدیر

تم ہی حسنِ چمن کی ہو تصویر
تم ہو بھارت کی جاگتی تقدیر
اے جواں سال دیش کے پیارو
تم ہو نہرو کے خواب کی تعبیر
شمعِ عزم و عمل کرو روشن
زندہ رہنے کی ہے یہی تدبیر
چاک کر دو لباسِ فتنہ و شر
کاٹ دو جور و ظلم کی زنجیر
جو وطن کے وقار کے ہیں عدو
آؤ کر دو انہیں تہہ شمشیر

دیکھ کر حالِ ملک اے شاہی
کیسے بیٹھے ہو صورتِ تصویر

نغمۂ آزادی

پھر اُمیدوں نے لی ہے انگڑائی
پھر بجی ہے خوشی کی شہنائی

اِسی آزادیِ وطن کے لئے
زندگی موت سے تھی ٹکرائی

کٹ گئیں بیڑیاں غُلامی کی
مٹ گئی ہندیوں کی رُسوائی

لاکھوں بیوہ ہوئیں جوانی میں
جھُولے پھانسی پہ کتنے سودائی

ذِلتیں سینکڑوں سہیں مِل کر
اور جھیلی ہے قیدِ تنہائی

اہلِ دِل نے فقط اِسی کے لئے
اپنی گردن خوشی سے کٹوائی

کاش! ہم اس کو رکھ سکیں باقی
یہ جو نعمت نصیب سے پائی

کِس ادا سے چمن میں اے شاہی
رقص کرتی ہوئی بہار آئی

•

بیدار کیا ہے ہم نے

قوم کو خواب سے بیدار کیا ہے ہم نے
فِتنہ سازوں سے خبردار کیا ہے ہم نے

ذرّے ذرّے کو ضیا بار کیا ہے ہم نے
کارواں نُور کا تیار کیا ہے ہم نے

اَے وطن تیری محبت کے ترانے گا کر
روحِ احساس کو سرشار کیا ہے ہم نے

کیا مجال اُنکو خزاں آنکھ اٹھا کر دیکھے
جن بہاروں کو سمن زار کیا ہے ہم نے

حرف آنے نہیں دینگے تِری عظمت پہ کبھی
مِل کے اک ساتھ یہ اقرار کیا ہے ہم نے

اَے ہما آ، تِرے دشمن کو کچلنے کے لئے
قوم کو برسرِ پیکار کیا ہے ہم نے

امیر کارواں نہرو

ترے دم سے ہے بام اوج پر قومی نشاں اپنا
تری سرکردگی میں بڑھ رہا ہے کارواں اپنا

تری شانِ کرم تابانیٔ اخلاق کیا کہیئے
ترے حسنِ عمل سے بن گیا سارا جہاں اپنا

عدو کی دھمکیوں سے شیر دل کب ڈرنے والے ہیں
کہ ہر اک گام پر ہوتا رہا ہے امتحاں اپنا

وطن کی راہ میں ثابت قدم ہیں سب وطن والے
خوشی سے جان دینا جانتا ہے ہر جواں اپنا

جلا کر خاک کر ڈالا نشیمن برقِ سوزاں نے
مگر مٹنے نہ پایا آج تک نام و نشاں اپنا

مٹانے کیلئے تاریکیٔ آفاق اے شاہی
چلا ہے ماہ و انجم ساتھ لیکر کارواں اپنا

پیغامِ سفر

دنیا سرائے فانی، دنیا دکھوں کا گھر ہے
جو چیز بھی یہاں ہے فانی ہے بے اثر ہے

جلوے وہ سامنے ہیں منزل قریب تر ہے
او زندگی کے راہی کرنا تجھے سفر ہے

یہ زندگی سفر ہے یہ زندگی سفر ہے

دریائے زندگی میں ہٹ ہٹ کے تو ابھر لے
کچھ اپنی زندگی میں پیدا کمال کر لے

اٹھ اپنی زندگی کا دامن وفا سے بھر لے
او بے خبر مسافر یہ بھی تجھے خبر ہے

یہ زندگی سفر ہے یہ زندگی سفر ہے

وہ دیکھ تجھ سے دشمن کتنا قریب تر ہے
تو ہے کہ اس سے ہر دم غافل ہے بے خبر ہے

تو شیر دل جواں ہے تو تیغ تیز تر ہے
دشمن کا سر اڑا دے ورنہ تجھے خطر ہے

یہ زندگی سفر ہے یہ زندگی سفر ہے

بانسری والے آجا

جلوے برساتا ہوا بانسری والے آجا
میرے تاریک مقدر کے اجالے آجا

تو نے دکھ درد کئے دور زمانے بھر کے
پڑ گیا ہوں غم و آلام کے پالے آجا

مسکراتی ہے مری تشنہ لبی پر دنیا
لے کے تو بادۂ عرفان کے پیالے آجا

ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہستی کی مری شام ہوئی
خون دینے لگے اب پاؤں کے چھالے آجا

میں پکاروں تجھے کب تک یہ نبھا جا آکر
لوٹے ٹکرا کے فلک سے مرے نالے آجا

پھونک دے روح نئی آ کے تنِ مردہ میں
لے کہاں تک ترا بیمار سنبھالے آجا

تو نے الجھن سے سداما کو چھڑایا تھا کبھی
الجھنوں سے مجھے دنیا کی چھڑا لے آجا

جیسے ارجن کو دیا مجھ کو بھی دے درسِ عمل
پڑ گیا ہوں ستمِ دہر کے پالے آجا

تیرے شاہی کی جدائی میں بسر عمر ہوئی!
آہیں کب تک بھرے کب تک کوئے نالے آجا

رُباعیات

پہلو میں وہ اب دل نہ جگر ہے ساقی
ہر چند مجھے اپنی خبر ہے ساقی
مانا کہ ہے بے مثل سخاوت تیری
لا جام پلا مجھکو اگر ہے ساقی

آپس کی یہ تفریق مٹا دے ہمدم
بگڑی ہوئی ہر بات بنا دے ہمدم
جینا تجھے مقصود ہے دنیا میں اگر
ہر دل کو محبت سے جلا دے ہمدم

ہستی کا پتہ وقتِ اجل دیتے ھیں
مر مر کے بھی پیغامِ عمل دیتے ھیں
آفاتِ زمانہ سے نہیں جو خائف
حالاتِ زمانہ کو بدل دیتے ھیں

دیوارِ ستم توڑ دیا کرتے ھیں
سفاک کا سر پھوڑ دیا کرتے ھیں
وہ لوگ جو ہیں صاحبِ ہمت شاہی
طوفان کا رخ موڑ دیا کرتے ھیں

یوں شامِ غم کی سیاہی نہ جائیگی ساقی
سُلگتا جام اُٹھاؤ بہت اندھیرا ہے

●

بھر کے دامن خوشی کے پھولوں سے
جب وہ جانِ بہار آتی ہے
ناچ اُٹھتی ہے رُوحِ فکر و نظر
زندگی سازِ دل پہ گاتی ہے

●